ترجمان القرآن

جلد ۸۱ اگست ۱۹۷۴ء عدد ۶

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

ابوالاعلیٰ مودودی

ادارۂ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

تصانیف مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

تفہیم القرآن

جلد اوّل سورۃ الفاتحہ ——— سورۃ الانعام
جلد دوم سورۃ الاعراف ——— سورۃ بنی اسرائیل
جلد سوم سورۃ الکہف ——— سورۃ الروم
جلد چہارم سورۃ لقمان ——— سورۃ الاحقاف
جلد پنجم سورۃ محمد ——— سورۃ الطلاق
جلد ششم سورۃ التحریم ——— سورۃ الناس

کتابت اعلیٰ • طباعت نفیس • [illegible] • سائز [illegible]

مختلف اجزاء

سورۃ الحجرات • سورۃ الفتح • سورۃ یٰسین • سورۃ لقمان
بہترین کتابت • دلکش طباعت • خوبصورت سہ رنگا کور

خطبات

		قیمت
حصہ اوّل	حقیقت اسلام	۴/- روپے
حصہ دوم	حقیقت صوم و صلوٰۃ	۲/۵۰ "
حصہ سوم	حقیقت زکوٰۃ	۲/- "
حصہ چہارم	حقیقت حج	۱/۰۵ "
حصہ پنجم	حقیقت جہاد	۱/۲۵ "

سفید کاغذ • [illegible] • سائز [illegible]

دینیات

سفید کاغذ • [illegible] • حسین سہ رنگا کور • قیمت: ۵/۲۵ روپے

خلافت و ملوکیت

سفید کاغذ • سائز [illegible]
خوبصورت سہ رنگا سرورق قیمت: ۱۶/- روپے

حقوق الزوجین

سفید کاغذ • سائز [illegible] • حسین سہ رنگا کور
قیمت [illegible] روپے

TOWARDS UNDERSTANDING ISLAM

DELUXE Rs. 11.00 PAPER BACK Rs. [illegible].00

ادارہ کی مکمل فہرست کتب طلب فرمانے پر مہیا کی جا سکتی ہے

اِدارہ ترجمان القرآن ۔ اچھرہ ، لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۸۱ | اگست ۱۹۷۴ء مطابق رجب ۱۳۹۴ھ | عدد ۶

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵ - اے ذیلدار پارک، اچھرہ - لاہور

زرِ سالانہ بارہ روپے - فی پرچہ ۱/۲۵ روپیہ

ابوالخیر مودودی پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس لاہور میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا۔

پرنٹر: محمد شفیع

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

مغرب کی تہذیبی یلغار اور اس کے سیاسی تسلّط کے بعد دنیائے اسلام میں جو خوفناک بگاڑ پیدا ہوا ہے اس کا اگر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس بگاڑ کو فاسد خیالات کے چار فتنوں نے جنم دیا ہے جن میں سے سب سے اہم مذہب اور سیاست کی علیحدگی کا مذموم تصور ہے جسے عوام کے ذہنوں میں بڑی ہنرمندی اور چابکدستی کے ساتھ بٹھایا گیا ہے۔ انہیں یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی ہے کہ مذہب ایک مقدس اور پاکیزہ چیز ہے اور سیاست شیطان کا کھیل ہے لہٰذا پاکیزگی کا تحفظ شیطنیت کو اس سے دُور رکھنے ہی سے ہو سکتا ہے۔ اس لیے جو فرد یا گروہ ان دونوں کو ایک دوسرے کے قریب لاتا ہے وہ مذہب جیسی مقدس شے کی شیطان کے ہاتھوں تذلیل کرواتا ہے۔ لہٰذا اس آسمان کے نیچے اُس سے بڑا ظالم اور سفاک اور نیکی اور بھلائی کا دشمن کون ہو سکتا ہے جو ایک پاک اور مقدس شے کو شیطان کی تحویل میں دینے کی کوشش کرے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص مذہب کے ساتھ سچی محبت رکھتا ہے اور خدا کی رضا کا اخلاص کے ساتھ طالب ہے اور آخرت میں دل کی گہرائیوں کے ساتھ سرخروئی کا خواہاں ہے تو اس کا فرض ہے کہ خود کو اور مذہب کو سیاست کی پرچھائیں سے پوری قوت کے ساتھ بچائے۔ اہل مغرب کا یہ جادو اپنے نتائج کے اعتبار سے اتنا ہمہ گیر اور مؤثر ثابت ہوا ہے کہ ملّت اسلامیہ کے ایک نہایت ہی محدود سے طبقے کو چھوڑ کر اہل علم اور ارباب تصوّف کی ایک کثیر تعداد نے مذہب اور سیاست کی دوئی کے فلسفے کو پوری طرح اپنا لیا اور سیاسی معاملات سے اس طرح تنفر اور دُوری اختیار کی جس طرح کہ کسی صریح حرام چیز سے اختیار کی جاتی ہے۔

مسلمانوں کے جن طبقوں نے مذہب اور سیاست کی جدائی کے نظریہ کو قبول کیا اُن میں یقیناً حاملین دین کا ایک نہایت مخلص طبقہ بھی تھا۔ ان حضرات نے مغربی سیاست کی چالبازیوں اور عیاریوں کو دیکھتے ہوئے اسلام کے تحفظ کے لیے یہی بہتر سمجھا کہ سیاسی مسائل سے پوری طرح کنارہ کشی اختیار کر کے ساری قوتیں اور

صلاحیتیں اسلامی تعلیمات کو فروغ دینے میں صرف کی جائیں لیکن اس ایک مخلص طبقے کے علاوہ جن مغرب پسند مسلمانوں نے یورپی اقوام کی پیروی میں مذہب کو سیاست سے جدا رکھنے پر زور دیا اور عامۃ الناس میں یہ مذموم خیال راسخ کرنے کی کوشش کی کہ امت مسلمہ کی بگڑی بنانے کی واحد صورت یہ ہے کہ ایک محدود سے مذہبی دائرے میں تو اسلام کی پیروی کی جائے اور زندگی کے باقی شعبوں میں اُن افکار و نظریات کو اپنایا جائے جو حاکم قوم کی طرف سے اُن پر ٹھونسے جا رہے ہیں، اُن کی نیت بخیر نہ تھی کیونکہ وہ سادگی کی بنا پر مسلمانوں کو یہ طرز عمل اختیار کرنے کا مشورہ نہ دے رہے تھے بلکہ دین اور سیاست کے مابین افتراق کے سارے مضمرات کو اچھی طرح جانتے ہوئے اس غیر اسلامی تصور کا پرچار کر رہے تھے۔ اُن کا مقصد بالکل وہی تھا جو اس معاملے میں اہل یورپ کا تھا۔ وہ مذہب اور سیاست کو ایک دوسرے سے اس بنا پر الگ نہیں رکھنا چاہتے تھے کہ اُن کے خیال میں ان دونوں کی ایک دوسرے سے قربت مذہب کی تقدیس کو مجروح کرنے کا باعث ہو سکتی ہے بلکہ ان کا مقصد یہ تھا کہ جس طرح مغربی قوموں نے مذہب کی جکڑ بندیوں کو ختم کر کے پوری زندگی کی عمارت الحاد پر تعمیر کی ہے بالکل اسی طرح مسلمان بھی حلال و حرام اور جائز و ناجائز کے چکروں سے نکل کر اپنی اجتماعی زندگی کو اقوام یورپ کی متابعت میں خالص الحاد کی بنیاد پر استوار کریں اور نہ صرف سیاست بلکہ معیشت، معاشرت اور قانون کے دائروں سے مذہب کا عمل دخل بالکل ختم کر دیں۔ پہلے گروہ کے نزدیک اگر مذہب اور سیاست میں جدائی کا محرک مذہب کے تقدس کا تحفظ تھا تو دوسرے کی غرض و غایت بجز اس کے اور کوئی نہ تھی کہ اسلام کو بھی زندگی کے اجتماعی معاملات میں اتنا غیر مؤثر اور بیکار بنا دیا جائے جس قدر کہ اہل یورپ نے عیسائیت کو بنایا ہے۔

نیتوں کے اس اختلاف کی وجہ سے دونوں طبقوں کے طرز عمل میں بھی وسیع اختلاف پایا جاتا ہے۔ پہلے طبقے نے مذہب کو سیاست سے تو جدا رکھا لیکن وہ ہمیشہ اس بات کے لیے کوشاں رہا کہ مذہب کے حقیقی خد و خال میں قطعاً کوئی تبدیلی نہ پیدا ہونے پائے اور اسلام گو سیاسی میدان میں نہ سہی لیکن معاشی، معاشرتی اور عائلی اُمور میں مسلم قوم کا رہنما ہو اور مسلمان اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ گہری محبت اور عقیدت پیدا کرنے کے علاوہ اپنی سیرت و اخلاق، اپنے کاروبار اور معاشرتی طرز عمل میں اسلام کے سچے نمونے ثابت ہوں۔ ان حضرات کی کاوشوں کا اگر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کی جد و جہد کا مقصود یہ تھا کہ اسلام کو مغرب

کی دستبرد سے جس حد تک بچایا جا سکتا ہو، بچانے کی کوشش کی جائے ۔ لیکن مسلمانوں کا مغرب پرست طبقہ ہمیشہ اس بات کے لیے کوشاں رہا کہ اسلام کے دائرہ اثر کو جس حد تک محدود کیا جا سکے، محدود کیا جائے اور جہاں اُسے مزید محدود کرنا ممکن نہ ہو وہاں اس کی تعلیمات کو اس طرح مسخ کر دیا جائے کہ اُن کے اور مغربی افکار و تصورات کے مابین کوئی امتیاز باقی نہ رہے اور اسلامی اقدار مادی اقدار کی بھونڈی نقالی معلوم ہوں جن سے مسلمان آہستہ آہستہ متنفر ہو کر مغربی تہذیب کے شیدائی بن جائیں ۔ جب ایک شخص کے پاس اصلی چیز موجود ہو تو اُسے نقل سے آخر کیا دلچسپی ہو سکتی ہے ۔ اسلام کو اگر مغربی تہذیب کا چربہ ہی بننا ہے تو آخر مسلمان اس سے کیوں چمٹے رہیں ؟ کیوں نہ وہ اُس اصل کو اپنانے کی کوشش کریں جس کا اسلام کے یہ نادان دوست دینی مواد سے چربہ تیار کرنے کے درپے ہیں ؟

تاریخ کے اوراق پر نظر دوڑائیے تو آپ پر یہ حقیقت پوری طرح منکشف ہو جائے گی کہ الہامی مذاہب کو سب سے زیادہ نقصان "روحانیت" کے ان ہی خواہوں کے ہاتھوں پہنچا ہے جنہوں نے ان کی تعلیمات کو موڑ توڑ کر وقت کے غالب افکار و رجحانات کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ۔ اُنھوں نے اپنی طرف سے اسے مذہب کی بہت بڑی خدمت خیال کیا مگر بنائے عمل میں یہ اُس کے خلاف ایک خوفناک سازش ثابت ہوئی اور اُن کے اس "عمل جراحی" سے دین نہایت قلیل مدت میں بے جان ہو کر رہ گیا ۔ چنانچہ دیکھیے کہ دنیا میں "اصلاح مذہب" کے نام پر دین میں ترمیم و تنسیخ کی جتنی تحریکیں بھی اُٹھی ہیں اِن سے مذہب کو تو کبھی کوئی فائدہ نہیں پہنچا البتہ ان تحریکات کے جلو میں الحاد اور دہریت کو غیر معمولی فروغ حاصل ہوا ۔ اِس کی وجہ بھی ظاہر ہے ۔ آپ اگر کسی مذہب کے متبعین کو یہ تاثر دیں کہ ان کا مذہب وقت کے تقاضوں سے اچھی طرح عہدہ برآ نہیں ہو سکتا اور اس میں حک و اضافہ کی ضرورت ہے تو پھر ہوشمند انسان لازمی طور پر اُس معیاری نظام کی طرف دیکھے گا جس کے معیار کے پیش نظر اُس کا مذہب ناقص قرار پایا ہے ۔ جب اُس کے پاس ایک صحیح اور مکمل نظام موجود ہو تو اُسے آخر اس بات کی کیا ضرورت پڑی ہے کہ وہ ایک ناقص نظام کے بعض حصّوں میں پیوند کاری اور بعض حصوں کی تراش خراش کر کے اسے معیاری نظام کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرے ۔ کیا اس کے لیے صحیح اور معقول راستہ یہ نہیں کہ وہ اس کار از رفتہ اور بیکار نظام کو چھوڑ کر اس احسن اور اکمل نظام کو سینے سے لگائے جس کے موجود ہونے کی وجہ سے دوسرے نظامہائے حیات کے نقائص اُبھر کر سامنے آتے ہیں ۔

ہمارے نزدیک ملت اسلامیہ کے لیے یہ ایک عظیم المیہ ہے کہ اس دَور میں جسے مادی تہذیب کے غلبے کا دور کہا جاتا ہے، مذہب اور سیاست کی علیحدگی کا پرچار کرتے میں وہ طبقہ پیش پیش رہا ہے جو اسلام کو عصر حاضر یا دوسرے لفظوں میں تہذیب حاضر کے سانچوں میں ڈھالنے پر مصر ہے اور اسے دین اور ملت اسلامیہ پر بہت بڑا احسان سمجھتا ہے، درآں حالیکہ دین حق کو جس قدر نقصان اس طبقے نے پہنچایا ہے اس کا تصور نہیں کیا جا سکتا - یہ اس طبقے کی مذموم کوششوں کا نتیجہ ہے کہ نہ صرف سیاست مذہب کے دائرہ عمل سے خارج ہو گئی ہے بلکہ معیشت، معاشرت، تہذیب و ثقافت، قانون و انصاف اور تعلیم و تربیت کے سارے شعبوں سے اسلام اس طرح بے دخل ہوا ہے جیسے کہ اسلامی تعلیمات کا اُن میں سے کسی ایک کے ساتھ بھی کوئی سروکار نہ تھا۔ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی سے اسلام کی بے دخلی کا اگر یہی عالم اور رفتار رہی تو وہ دن دُور نہیں کہ وہ دینِ حق جو تمام ادیان پر غالب اور فتحیاب ہونے کے لیے آیا ہے وہ محض ایک قصۂ پارینہ بن کر رہ جائے اور مسلمان اپنی انفرادی زندگی کے محدود سے دائرے میں بھی یا تو اس پر عمل پیرا ہونے کی آرزو سے خالی ہو جائیں اور اگر وہ آرزومند بھی ہوں تو ان کی راہ میں اس قدر موانع حائل ہو جائیں کہ اُن کی یہ آرزو، آرزو ہی رہے، شرمندہ تعبیر نہ ہو سکے اور ان کی پوری زندگی --- انفرادی بھی اور اجتماعی بھی --- اسلام کی محبت کا دم بھرنے کے باوجود کفر سے معمور رہو۔

مذہب اور سیاست کی جدائی کا فلسفہ یوں تو ہر مذہب کے لیے سَم قاتل ہے لیکن خاص طور پر اسلام جیسے انقلاب انگیز اور ہمہ گیر دین کے لیے یہ بربادی اور موت کا پیغام ہے - بعض سادہ لوح مسلمان اس فلسفے کے عواقب سے ناواقف ہونے کی بنا پر اس کے طلسم میں گرفتار ہو جاتے ہیں لیکن اگر وہ اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کریں تو اس کی غیر معقولیت جلد ہی کھل کر اُن کے سامنے آ جائے گی - آپ اس حقیقت کو جاننے کے لیے سب سے پہلے کسی قوم کی اجتماعی زندگی میں ہیئت حاکمہ کے مقام کا تعین کریں - علم سیاست کی فنی پیچیدگیوں سے ہٹ کر اگر اس اہم شعبہ حیات پر غور کیا جائے تو اس حقیقت کا جاننا کچھ مشکل نہیں کہ نظام حکومت پر مکمل اختیار ہونے کی وجہ سے حیات انسانی کے سارے شعبوں کی تنظیم اور ان سب کے مابین معنوی ربط اور مقصدی ترتیب پیدا کرنے کا کام صرف شعبہ سیاست ہی کرتا ہے - اس شعبہ کی حیثیت اس ناظم کی سی ہے جو نہ صرف اپنے ماتحتوں پر بڑے وسیع اختیارات رکھتا ہے بلکہ ان کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری بھی براہ راست اسی پر عائد

ہوتی ہے۔ وہ اُن کے افکار و نظریات کو جس سانچے میں چاہے ڈھالے، جن عادات کو اُن کے اندر راسخ کرنا چاہے راسخ کرے اور پھر ان کی قوتوں اور صلاحیتوں کو جن مقاصد کے حصول کی خاطر چاہے استعمال کرے کوئی اس کی راہ نہیں روک سکتا۔ ہمیں یہ تسلیم ہے کہ انسان ان ناظمین کے ہاتھوں میں اس طرح بے بس نہیں ہوتے جس طرح کہ ظروف سازوں کے ہاتھ میں گندھی ہوئی مٹی کا گوندا۔ انسانوں کے فطری داعیات کے اختلاف کی وجہ سے اُن کے طرز عمل ایک دوسرے سے الگ اور جدا ہوتے ہیں لیکن جس چیز کو لوگ اجتماعی ماحول کے نام سے موسوم کرتے ہیں وہ اُس نہج پر تیار ہوتا ہے جس پر کہ یہ ناظمین اُسے تیار کرنے کا عزم رکھتے ہوں۔

کسی قوم کی اجتماعی زندگی میں ہیئتِ حاکمہ بالکل وہی حیثیت رکھتی ہے جو کسی گاڑی کے لیے اس کے انجن کی ہوتی ہے۔ گاڑی کے مختلف ڈبوں کو کسی قوم کے معاشرتی اور معاشی ڈھانچوں سے تعبیر کر لیجیے اور ان میں بیٹھے ہوئے مسافروں کو معاشرے کے افراد پر قیاس کیجیے تو آپ کو حیاتِ اجتماعی کے سیاسی انجن کے سامنے ان کی بے بسی کا بخوبی اندازہ ہو سکے گا۔ جن ڈبوں کو اس انجن کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہو اور جو مسافر ان ڈبوں میں بیٹھ گئے ہوں وہ اس بات کے لیے بالکل مجبور ہوتے ہوتے ہیں کہ اُسی سمت آگے بڑھیں جس سمت کے انجن انہیں کھینچے لیے جا رہا ہے۔ بعض لوگ اگر اس سمت کو غلط سمجھ رہے ہوں اور انہیں اس امر کا احساس ہو کہ اُن کی منزل مقصود دوسری سمت میں ہے تو ان کے لیے واحد راستہ یہی ہے کہ وہ انجن کو روکنے کی کوشش کریں اور پھر اُسے اُس سمت بڑھانے کے لیے ہاتھ پاؤں ماریں جس سمت وہ آگے بڑھنا چاہتے ہیں۔ انجن کو روکے بغیر اور اُسے صحیح سمت پر ڈالے بغیر غلط سمت کا واویلا کرنا دل کی بھڑاس نکالنے کے علاوہ ایک مقدس آرزو کا اظہار تو ضرور ہے لیکن میدان عمل میں اِس سے کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔

نیکی اور روحانیت کے بعض علمبردار بڑی معصومیت کے ساتھ سیاست کی وادی کو شیطان کی جولانگاہ قرار دیتے ہیں لیکن وہ یہ نہیں سمجھتے کہ اِس وادی پر اس مردود کا کوئی پیدائشی حق تو نہیں۔ یہ وادی اِس لیے اُس کی جولانگاہ بن گئی ہے کہ حق پرستوں نے از خود اس سرسبز و شاداب وادی کو اِس ظالم کی تگ و دتاز کے لیے آزاد چھوڑ دیا ہے اور خود حیاتِ انسانی کے کونوں کھدروں میں دبک کر

بیٹھنے کو ہی دنیوی فلاح اور آخروی کامرانی کا مؤثر ذریعہ خیال کیا ہے۔ سیاست بلاشبہ ایک ناپاک کھیل بن گیا ہے لیکن اس کے ساتھ اس بات کو بھی اچھی طرح نگاہ میں رکھنا چاہیئے کہ اس گندے کھیل نے ہی پوری زندگی کے اندر تعفن پیدا کیا ہے۔ اب اگر کوئی فرد یا گروہ سیاست کے میدان کو چھوڑ کر زندگی کے دوسرے میدانوں میں خیر اور بھلائی کی عملداری دیکھنا چاہتا ہے تو وہ جب تک بُرائی کے اُس چشمے کو بند نہیں کرتا ہے جس کی وجہ سے بُرائی دوسرے میدانوں میں پھیل رہی اور پرورش پا رہی ہے، اُس وقت تک چند مخصوص میدانوں میں خیر اور بھلائی کو کس طرح فروغ دیا جا سکتا ہے اور اگر بالفرض پوری قوت کے ساتھ جدوجُہد کر کے ایک ایسی جذباتی فضا قائم بھی کر لی جائے جس میں بُرائی وقتی طور پر دبتی نظر آئے تو اس دھارے کے رُخ کو مستقل طور پر کس طرح موڑا جا سکتا ہے جو سرکش طوفان کی صورت میں اس کی طرف یلغار کر رہا ہے۔ اِن وقتی اور جذباتی تدبیروں کا ایک ہی نتیجہ سامنے آئے گا کہ بُرائی بپھری ہوئی موجوں کی طرح زندگی کے بظاہر محفوظ و مامون شعبوں کو پوری شدت کے ساتھ اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔ اجتماعی زندگی کوئی ایسی کشتی نہیں جو بالکل خاموش سطحِ آب پر تفریح کے انداز میں تیرتی رہے، یہ تو ایک سیلِ بلا کا نام ہے جس کی زد سے زندگی کا کوئی گوشہ بلکہ قلب و دماغ کا کوئی ریشہ بھی محفوظ نہیں رہ سکتا۔ الناس علیٰ دین ملوکھم ایک جانی پہچانی حقیقت ہے جس پر پوری دنیا گواہ ہے لیکن بعض لوگ اس کے بارے میں اِس غلط فہمی کا شکار رہتے ہیں کہ عوام الناس از خود اپنے شوق سے سلاطین و ملوک کے طور طریقے اپناتے ہیں۔ تختِ شاہی پر براجمان افراد لوگوں کو اس بات کے لیے مجبور نہیں کرتے۔ ممکن ہے کسی دَور میں اس خوش فہمی بلکہ غلط فہمی کے لیے کوئی تھوڑی بہت وجہ موجود ہو مگر آج کے دَور میں تو اِس انداز پر سوچنا غلط فہمی ہی نہیں بلکہ سراسر نافہمی ہے۔ آج کے ملوک و سلاطین بادشاہت کے نام پر نہیں بلکہ قائدینِ عوام کے نام پر خاص مقاصد کی تکمیل کی غرض سے تختِ اقتدار پر متمکن ہوتے ہیں اور پھر اس بات کے لیے کوشاں رہتے ہیں کہ ایک تو اپنے عہدِ اقتدار کو زیادہ سے زیادہ طول دیں اور دوسرے زندگی کے سارے شعبوں کی اس انداز سے تنظیمِ نو کریں جس سے اُن کے مخصوص مقاصد کی تکمیل ممکن ہو۔ انتہائی سادہ دل ہے وُہ فرد یا گروہ جو یہ سمجھتا ہے کہ اگر اقتدار سے تعرض نہ کیا جائے تو وہ تبلیغ و اصلاح کے کام کو بڑے اطمینان کے ساتھ سرانجام دے سکتا ہے۔ اقتدار تبلیغ و اصلاح کے کسی کام کو اس حد تک گوارا کرتا ہے اور بعض حالات

ہیں اسے بنظرِ استحسان بھی دیکھتا ہے حب تک اقتدار کے اِس مقدس کام ہیں اِس کے لیے خطرہ کا کوئی پہلو نہ ہو لیکن جونہی وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ تبلیغ وارشاد کا پروگرام اُس کے پیشِ نظر مقاصد کی تکمیل کی راہ میں رکاوٹ بن سکتا ہے تو پھر وہ پوری قوت سے اس کا راستہ روکنے کی کوشش کرتا ہے۔

مغربی سامراج کے سامنے جتنی مُسلم سلطنتیں بھی سرنگوں ہوئیں اُن سب میں مسلمانوں کو یہی مژدہ جانفزا سنایا جاتا رہا کہ ہم تو صرف نظامِ حکومت کو بہتر بنانے کے لیے اِس ملک پر قابض ہوئے ہیں۔ دین کے معاملے میں بندگانِ خدا بالکل آزاد ہیں بلکہ اِس باب میں تو ہم اُن کے ساتھ ہر طرح کا تعاون کرنے کے لیے بھی تیار ہیں بشرطیکہ وہ اقتدار کی طمع دِل سے نکال دیں اور اس پر ہمارے قبضہ کو خوشدلی سے قبول کرلیں۔ مسلمانوں نے اِس اعلان کو غنیمت سمجھا لیکن چند سال بھی گزرنے نہ پائے تھے کہ دین کی آزادی اور اس کے تحفظ کے قول وقرار کے باوجود اُن کے عقائد بگڑنے لگے، اُن کے افکار ونظریات میں انتشار پیدا ہونا شروع ہوا، اُن کے اخلاق پر تباہی کے مہیب سائے چھانے لگے، ان کی معیشت میں حلال اجزاء گھٹنے لگے اور حرام کا عنصر بڑھنے لگا اور اُن کی معاشرت سے وہ تمام خوبیاں رخصت ہونے لگیں جن کی وجہ سے اس کی پاکیزگی قائم تھی اور یہ سب کچھ مسلمانوں کے منشا کے علی الرغم ہوا۔ وہ اس صورتِ حال پر کبھی خوش نہ تھے بلکہ خون کے آنسو بہاتے تھے مگر جو لوگ اقتدار پر قابض تھے اُنھوں نے اِس کی غیر معمولی قوت اور وسیع اختیارات سے فائدہ اُٹھا کر ایک مسلمان کے لیے بحیثیتِ مسلمان زندہ رہنا بالکل ناممکن بنا دیا۔ اللہ رب العزت کا مخلص بندہ اپنی اُولاد کو اللہ اور اس کے رسولؐ کی تعلیمات پر عمل پیرا دیکھنا چاہتا تھا لیکن اُس نے اپنے جگر پاروں کو خدا اور اُس کے رسولؐ کے باغیوں کی صف میں پایا، وہ معاشی میدان میں اکل حلال کے لیے جدوجہد کرنا چاہتا تھا لیکن اُسے اپنا پیٹ بھرنے کے لیے لقمۂ حرام کے سوا کوئی دوسری چیز نظر نہ آئی، وہ زندگی کے ہر شعبے میں حق وصداقت کی راہ پر گامزن ہونے کا متمنی تھا لیکن غیر اسلامی نظام کے تسلط کی وجہ سے وہ قدم قدم پر حق وصداقت کا خون کرنے پر مجبور ہوا اور تضاد کی اس ہولناک فضا نے نہ صرف اس کی ساری قوتوں اور صلاحیتوں کو برباد کر کے رکھ دیا بلکہ اُس کے سینے میں دینی آرزوؤں کے جو چراغ روشن تھے اُنہیں بھی گُل کر دیا۔

اُمتِ مسلمہ کے بعض سادہ لوح بھی خواہ بڑے جوش اور جذبۂ اخلاص سے کہتے ہیں (باقی برصفحہ ۴۸)

رسالتِ محمدی پر ایمان کی دعوت

(۲)

دین حق کو پورے نظام زندگی پر غالب کر دینا آپؐ کی بعثت کا آخری مقصد اُس دین و ہدایت کو تمام اقسام کی اطاعتوں اور زندگی کے تمام طریقوں پر غالب کر دینا تھا جسے آپ خدا کی طرف سے لائے تھے۔ اس مقصد کی صراحت قرآن میں تین مقامات پر کی گئی ہے۔ سورۂ توبہ اور الصف میں فرمایا: "وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ وہ اسے پوری جنس دین پر غالب کر دے[1]۔

---

[1] آیت میں الدین کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کا ترجمہ ہم نے "جنس دین" کیا ہے۔ دین کا لفظ عربی زبان میں اُس نظام زندگی یا طریق زندگی کے لیے استعمال ہوتا ہے جس کے قائم کرنے والے کو سند اور مُطاع تسلیم کر کے اُس کا اتباع کیا جائے۔ پس بعثتِ رسول کی غرض اس آیت میں یہ بتائی گئی ہے کہ جس ہدایت اور دینِ حق کو خدا کی طرف سے اس کا رسول لے کر آیا ہے اسے دین کی نوعیت رکھنے والے تمام طریقوں اور نظاموں پر غالب کر دے۔ دوسرے الفاظ میں رسول کی بعثت کبھی اس غرض کے لیے نہیں ہوئی ہے کہ جو نظام زندگی اللہ کے سوا دوسروں کو سند اور مُطاع مان کر چل رہا ہو، رسول کا لایا ہوا دین اُس کا تابع اور مغلوب بن کر اس کی دی ہوئی رعایتوں اور گنجائشوں میں سمٹ کر رہے بلکہ رسول تو بادشاہِ ارض و سما کا نمائندہ بن کر آتا ہے اور اپنے بادشاہ کے نظامِ حق کو سب طریقوں اور نظاموں پر غالب کرنا چاہتا ہے۔ اگر کوئی دوسرا نظامِ زندگی دنیا میں رہے بھی تو اُسے خدائی نظام کی بخشی ہوئی رعایتوں اور گنجائشوں میں سمٹ کر رہنا چاہیے جیسا کہ جزیہ ادا کرنے کی صورت میں ذمیوں کا نظامِ زندگی رہتا ہے۔

خواہ مشرکوں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو" (التوبہ آیت ۳۳ - الصف آیت ۸) - یہی مضمون سورۂ فتح میں بیان کرکے فرمایا گیا ہے "اور اس حقیقت پر اللہ کی گواہی کافی ہے" (آیت ۲۸)

حضورؐ پر ایمان اور آپ کی اطاعت کا حکم

انہی مقاصد کے عین مطابق لوگوں کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ آپ پر ایمان لائیں، آپ کی پیروی کریں، آپ کی اطاعت کریں اور ایسے سب لوگوں کی اطاعت چھوڑ دیں جو اللہ سے غافل اور حدِ بندگی سے تجاوز کرنے والے ہیں۔

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالنُّوْرِ الَّذِيْٓ اَنْزَلْنَا ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ (التغابن - ۸)۔

پس ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر اور اُس نور پر جو ہم نے نازل کیا ہے۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ (الاعراف - ۱۵۸)۔

پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے بھیجے ہوئے نبیِ اُمّی پر جو اللہ اور اس کے ارشادات پر ایمان رکھتا ہے اور پیروی اختیار کرو اُس کی تاکہ تمہیں راہِ راست مل جائے۔

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَاۗءَ (الاعراف - ۳)۔

پیروی کرو اُس ہدایت کی جو تمہاری طرف تمہارے رب کی جانب سے بھیجی گئی ہے اور اس کے سوا دوسرے سرپرستوں کی پیروی نہ کرو۔[1]

---

[1] یعنی تم کو دنیا میں زندگی بسر کرنے کے لیے جس ہدایت و رہنمائی کی ضرورت ہے، اپنی اور کائنات کی حقیقت اور اپنے وجود کی غرض و غایت سمجھنے کے لیے جو علم انہیں درکار ہے، اور اپنے مذہب، اخلاق، تہذیب، معاشرت اور تمدن کو صحیح بنیادوں پر قائم کرنے کے لیے جن اصولوں کے تم محتاج ہو ان سب کے لیے تمہیں صرف اُس ہدایت کی پیروی کرنی چاہیے جو اللہ نے اپنے رسول کے ذریعہ سے بھیجی ہے۔ اللہ کی نازل کردہ ہدایت کو چھوڑ کر کسی دوسرے رہنما کی طرف ہدایت کے لیے رجوع کرنا اور اپنے آپ کو اُس کی رہنمائی کے حوالے کر دینا انسان کے لیے بنیادی طور پر ایک غلط طریق کار ہے جس کا نتیجہ ہمیشہ تباہی کی صورت میں نکلا ہے اور ہمیشہ تباہی کی صورت ہی میں نکلے گا۔ یہاں "اولیاء" (سرپرستوں) کا لفظ اس معنی میں استعمال ہوا ہے کہ انسان جس کی رہنمائی پر چلتا ہے اُسے درحقیقت اپنا ولی و سرپرست بناتا ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۔ (النساء ۔ ۶۴)	ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے اسی لیے بھیجا ہے کہ اِذنِ خداوندی کی بنا پر اس کی اطاعت کی جائے۔[1]
مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۔ (النساء ۔ ۸۰) ۔	جو رسول کی اطاعت کرے اس نے دراصل اللہ کی اطاعت کی۔
وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۔ (الحشر ۔ ۷) ۔	جو کچھ رسول تمہیں دے وہ لے لو اور جس چیز سے روک دے اس سے رک جاؤ۔
وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَخْشَ اللّٰهَ وَيَتَّقْهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ (النور ۔ ۵۲) ۔	اور جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت اور اللہ سے ڈرے اور اس کی نافرمانی سے بچے، ایسے ہی لوگ کامیاب ہیں۔
وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ۔ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا (الاحزاب ۳۶) ۔	کسی ایمان لانے والے مرد یا ایمان لانے والی عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملہ کا فیصلہ کر دے تو پھر اسے اپنے معاملے میں خود فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل رہے۔ اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے وہ صریح گمراہی میں پڑ گیا۔
وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ	اور کسی ایسے شخص کی اطاعت نہ کرو جس

[1] یعنی خدا کی طرف سے رسول اس لیے نہیں آتا ہے کہ بس اُس کی رسالت پر ایمان لے آؤ اور پھر اطاعت جس کی چاہو کرتے رہو۔ بلکہ رسول کے آنے کی غرض ہی یہ ہوتی ہے کہ زندگی کا جو قانون وہ لے کر آیا ہے، تمام قوانین کو چھوڑ کر صرف اُسی کی پیروی کی جائے اور خدا کی طرف سے جو احکام وہ دیتا ہے، تمام احکام کو چھوڑ کر صرف اُنہی پر عمل کیا جائے۔ اگر کسی نے یہ نہ کیا تو پھر اُس کا محض رسول کو رسول مان لینا کوئی معنی نہیں رکھتا۔

عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا۔ (الکہف - ۲۸)۔

کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا اور جس نے اپنی خواہشِ نفس کی پیروی کی اور جس کا طریقِ کار افراط و تفریط پر مبنی ہے:

وَلَا تُطِيْعُوْٓا اَمْرَ الْمُسْرِفِيْنَ الَّذِيْنَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ (الشعراء ۱۵۱-۱۵۲)۔

اور اُن بے لگام لوگوں کی اطاعت نہ کرو جو زمین میں فساد برپا کرتے ہیں اور کوئی اصلاح نہیں کرتے۔[1]

قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ۔ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ - (آل عمران - ۳۲)۔

اے نبیؐ، کہہ دو کہ اللہ اور رسول کی اطاعت کرو۔ پھر اگر وہ (اس بات کو قبول کرنے سے) منہ موڑیں تو اللہ ایسے کافروں کو پسند نہیں کرتا۔

اب قانون وہ ہے جو اللہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے دیا ہے

اسی طرح حضور کی رسالت کے اعلان اور آپ کی اطاعت و پیروی کے حکم کے ساتھ یہ بھی اعلان کر دیا گیا کہ اب خدا کا قانون وہ ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے دیا گیا ہے، کسی کو اس میں آپ سے نزاع کا حق نہیں ہے، اُس کے خلاف جو کچھ ہے جاہلیت اور طاغوت کی بندگی ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے مقرر کردہ حاکم ہیں جن کا کام یہ ہے کہ لوگوں کے معاملات کا فیصلہ اللہ کی نازل کردہ ہدایت کے مطابق کریں۔

ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاۗءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ (الجاثیہ - ۱۸)

پھر (بنی اسرائیل کے بعد) اے نبیؐ، ہم نے تم کو دین کے معاملہ میں ایک صاف شاہراہ (شریعت) پر قائم کر دیا ہے، لہٰذا تم اسی کی پیروی کرو اور ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کرو جو علم نہیں رکھتے۔

[1] یعنی اپنے اُن امراء و رؤساء اور ان رہنماؤں اور حاکموں کی اطاعت چھوڑ دو جن کی قیادت میں تمہارا یہ فاسد نظامِ زندگی چل رہا ہے۔ یہ حد سے گزرے ہوئے لوگ ہیں، اخلاق کی ساری حدیں پھاند کر شترِ بے مہار بن چکے ہیں۔ ان کے ہاتھوں سے کوئی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ یہ جس نظام کو چلائیں گے اس میں بگاڑ ہی پھیلے گا۔ تمہارے لیے فلاح کی کوئی صورت اگر ہے تو صرف یہ کہ اپنے اندر خدا ترسی پیدا کرو اور مفسدوں کی اطاعت چھوڑ کر میری اطاعت کرو۔

لِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا هُمْ نَاسِكُوهُ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْأَمْرِ وَادْعُ إِلَىٰ رَبِّكَ إِنَّكَ لَعَلَىٰ هُدًى مُّسْتَقِيمٍ۔

(الحج - ۶۷)

ہر اُمّت کے لیے ہم نے ایک طریقِ عبادت (یا طریقِ بندگی) مقرر کیا ہے جس کی وہ پیروی کرتی ہے۔ پس اے محمدؐ، اس معاملہ میں وہ تم سے جھگڑا نہ کریں[1]۔ تم اپنے رب کی طرف دعوت دو، یقیناً تم سیدھے راستے پر ہو۔

إِنَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللَّهُ۔

(النساء - ۱۰۵)

اے نبیؐ، ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ تمہاری طرف نازل کی ہے تاکہ جو راہِ راست اللہ نے تم کو دکھائی ہے اس کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو۔

قرآن مجید میں جگہ جگہ انسانی معاشرے کے لیے جو قواعد بیان کیے گئے اُن کے لیے "حدود اللہ" کے الفاظ استعمال فرمائے گئے، یعنی یہ وہ حدیں ہیں جن کے اندر رہنے کا اللہ نے حکم دیا ہے۔ پھر کہیں سختی کے ساتھ متنبہ کیا گیا کہ ان سرحدوں کے قریب نہ پھٹکنا، کہیں فرمایا گیا کہ ان سے تجاوز کرنے والے ظالم ہیں، کہیں ارشاد ہوا کہ ان سے تجاوز کرنے والے اپنے اوپر آپ ظلم کرتے ہیں، اور کہیں خبردار کیا گیا کہ تجاوز کرنے والوں کے لیے نارِ جہنم یا عذابِ الیم ہے۔ (ملاحظہ ہو البقرہ، آیات ۱۸۷، ۲۲۹ - ۲۳۰ — النساء ۱۳ - ۱۴ — المجادلہ ۴ - الطلاق ۱ - التوبہ ۹۷) - اس سے معلوم ہوگیا کہ اس قانون کی اہمیت کیا ہے جو حضورؐ کے ذریعہ سے انسانوں کو دیا گیا ہے۔

اور پھر صاف صاف خبردار کر دیا گیا کہ:

أَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُونَ ۚ وَمَنْ

تو پھر کیا یہ لوگ جاہلیت[2] کا فیصلہ چاہتے ہیں۔

---

[1] یعنی جس طرح پہلی اُمتوں کے انبیاء اپنے اپنے دور کے لیے ایک مَنسَک (طریقِ عبادت و بندگی) لائے تھے اسی طرح اِس دور کی اُمّت کے لیے تم ایک مَنسَک لائے ہو۔ اب کسی کو تم سے نزاع کا حق نہیں ہے، کیونکہ اس دور کے لیے یہی مَنسَک ہے جو تم لائے ہو۔

[2] جاہلیت کا لفظ اسلام کے مقابلہ میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اسلام کا طریقہ سراسر علم ہے کیونکہ اس کی طرف خدا نے رہنمائی کی ہے، جو تمام حقائق کا علم رکھتا ہے۔ اس کے برعکس ہر وہ طریقہ جو اسلام سے مختلف ہے، جاہلیت کا طریقہ ہے۔

اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ (المائدہ - ۵۰)۔	حالانکہ جو لوگ (اللہ پر) یقین رکھتے ہیں ان کے لیے اللہ سے بہتر حکم کس کا ہو سکتا ہے۔
يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ ۭ وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا (النساء - ۶۰)۔	وہ چاہتے ہیں کہ اپنے معاملات کا فیصلہ کرانے کے لیے طاغوت کی طرف رجوع کریں حالانکہ انہیں طاغوت سے کفر کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور شیطان چاہتا ہے کہ وہ گمراہی میں دُور نکل جائیں۔

دین کے معاملہ میں کسی مصالحت و مداہنت کی گنجائش نہیں

اطاعت و اتباعِ رسول کے اِس صاف صاف حکم کے ساتھ لوگوں کو خبردار کر دیا گیا کہ خدا کے دین کے معاملہ میں کوئی مصالحت و مداہنت نہیں ہو سکتی۔ کسی عقیدے، کسی اصول، کسی ضابطے اور قاعدے اور کسی حکم کے اندر کسی کی خاطر ادنیٰ سا رد و بدل بھی نہیں ہو سکتا۔ جس کو ماننا ہو وہ اُس پورے دین کو مانے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پیش فرما رہے ہیں، اور جسے نہ ماننا ہو وہ نہ مانے۔ مانے گا تو اپنا ہی بھلا کرے گا، نہ مانے گا تو اپنا ہی نقصان کرے گا۔ یہاں کسی سودے بازی اور لین دین پر سمجھوتے کا قطعاً کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ۔ وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ (القلم - ۸-۹)	پس اے نبی، جھٹلانے والوں کے دباؤ میں ہرگز نہ آؤ۔ وہ چاہتے ہیں کہ کچھ تم مداہنت کرو تو وہ بھی مداہنت کریں (یعنی تم اسلام کی تبلیغ میں کچھ ڈھیل اختیار کرو تو یہ بھی تمہاری مخالفت میں کچھ نرمی اختیار کر لیں، یا تم ان کی گمراہیوں کی رعایت کر کے اپنے دین میں کچھ ترمیم کر لو تو یہ تمہارے ساتھ مصالحت کر لیں)۔

لہ یہاں صریح طور پر طاغوت سے مراد وہ حاکم ہے جو قانونِ الٰہی کے سوا کسی دوسرے قانون کے مطابق فیصلہ کرتا ہو، اور وہ نظامِ عدالت ہے جو نہ تو اللہ کے اقتدارِ اعلیٰ کو تسلیم کرتا ہو اور نہ اللہ کی کتاب اور اُس کے رسول کی ہدایت کو آخری سند مانتا ہو۔

وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ قَالَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا ائْتِ بِقُرْآنٍ غَيْرِ هَٰذَا أَوْ بَدِّلْهُ ۚ قُلْ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أُبَدِّلَهُ مِنْ تِلْقَاءِ نَفْسِي ۖ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ ۖ (یونس-۱۵)	اور جب انھیں ہماری صاف صاف آیات سنائی جاتی ہیں تو جو لوگ (آخرت میں) ہم سے ملنے کی امید نہیں رکھتے وہ کہتے ہیں کہ اس کے سوا کوئی اور قرآن لاؤ، یا اس میں کچھ ترمیم کرو[1]۔ اے محمدؐ، ان سے کہو مجھے یہ حق نہیں ہے کہ اپنی طرف سے اس میں کوئی تغیر و تبدل کر لوں۔ میں تو بس اُس وحی کا پیرو ہوں جو میرے پاس بھیجی جاتی ہے۔
وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكُمْ ۖ فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ ۚ (الکہف-۲۹)۔	اور کہہ دو کہ یہ حق ہے تمہارے رب کی طرف سے اب جس کا جی چاہے مانے اور جس کا جی چاہے نہ مانے۔

[1] مشرکین کا یہ قول اوّل تو اس مفروضے پر مبنی تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ پیش کر رہے ہیں وہ خدا کی طرف سے نہیں ہے بلکہ ان کے اپنے دماغ کی تصنیف ہے اور اس کو خدا کی طرف منسوب کر کے انہوں نے صرف اس لیے پیش کیا ہے کہ ان کی بات کا وزن بڑھ جائے۔ دوسرے اُن کا مطلب یہ تھا کہ یہ تم نے توحید اور آخرت اور اخلاقی پابندیوں کی بحث کیا چھیڑ دی؟ اگر رہنمائی کے لیے اُٹھے ہو تو کوئی ایسی چیز پیش کرو جس سے قوم کا بھلا ہو اور اس کی دنیا بنتی نظر آئے۔ تاہم اگر تم اپنی اس دعوت کو بالکل نہیں بدلنا چاہتے تو کم از کم اس میں کچھ لچک ہی پیدا کرو تاکہ ہمارے اور تمہارے درمیان کم و بیش پر مصالحت ہو سکے۔ کچھ ہم تمہاری مانیں کچھ تم ہماری مان لو۔ تمہاری توحید میں کچھ ہمارے شرک کے لیے، تمہاری خدا پرستی میں کچھ ہماری نفس پرستی اور دنیا پرستی کے لیے، اور تمہارے عقیدۂ آخرت میں کچھ ہماری اِن اُمیدوں کے لیے بھی گنجائش نکلنی چاہئے کہ دنیا میں ہم جو چاہیں کرتے رہیں، آخرت میں ہماری کسی نہ کسی طرح نجات ضرور ہو جائے گی۔ پھر تمہارے یہ قطعی اور حتمی اخلاقی اصول بھی ہمارے لیے ناقابلِ قبول ہیں۔ ان میں کچھ ہمارے تعصبات کے لیے، کچھ ہمارے رسم و رواج کے لیے، کچھ ہماری شخصی اور قومی اغراض کے لیے، اور کچھ ہماری خواہشاتِ نفس کے لیے بھی جگہ نکلنی چاہیئے۔ کیوں نہ ایسا ہو کہ دین کے مطالبات کا مناسب دائرہ ہماری اور تمہاری رضامندی سے طے ہو جائے اور اس میں ہم خدا کا حق ادا کر دیا کریں۔ اس کے بعد ہمیں آزاد چھوڑ دیا جائے کہ جس جس طرح اپنی دنیا کے کام چلانا چاہتے ہیں چلائیں۔ مگر تم یہ غضب کر رہے ہو کہ پوری زندگی کو اور سارے معاملات کو توحید و آخرت کے عقیدے اور شریعت کے ضابطے میں کس دینا چاہتے ہو۔

فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِىْ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ ضَلَّ فَقُلْ اِنَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ (النمل-۹۲)۔	پھر جو ہدایت اختیار کرے وہ اپنے ہی بھلے کے لیے ہدایت اختیار کرے گا اور جو گمراہ ہو اس سے کہہ دو کہ میں تو صرف خبردار کرنے والا ہوں۔

قریش اور مشرکینِ عرب کا ردِ عمل اس تفصیل سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ دعوتِ اسلامی کا دوسرا نکتہ، یعنی لوگوں سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت تسلیم کرانا اور اُن کو اس بات پر آمادہ کرنا کہ وہ عقائد و عبادات سے لے کر زندگی کے ہر شعبے تک تمام معاملات میں آپ کی مکمل اطاعت و پیروی قبول کرلیں، اپنے اندر کیا کیا اہمیت رکھتا تھا۔ اس کی اہمیت یہ تھی کہ دین اس کے بغیر عملاً قائم نہ ہو سکتا تھا، اور رسول پر ایمان اور بالفعل اس کی اطاعت کے بغیر محض خدا کی توحید کو تسلیم کرلینا لاحاصل تھا۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو انسان محسوس کر سکتا ہے کہ اللہ کی توحید کو مان لینا قریش اور عام مشرکینِ عرب کے لیے جتنا مشکل تھا، اس سے بہت زیادہ مشکل رسالت کو ماننا تھا۔ اول تو یہی بات ان کے لیے کچھ آسان نہ تھی کہ جو شخص چالیس برس تک اُن کے ہاں عام انسانوں کی طرح رہا بسا تھا اس کے متعلق وہ یہ باور کرلیں کہ یکایک وہ اللہ کا رسول مقرر ہو گیا ہے اور اس کے پاس وحی آنے لگی ہے۔ پھر جو لوگ صدیوں سے بے لگام آزادی کے عادی تھے، ان کے لیے اب ایک شخص کی بے چوں وچرا اطاعت اور اپنی پوری زندگی میں اس کے دیئے ہوئے قانون کی پیروی قبول کرلینا بھی کچھ کم دشوار نہ تھا۔ اور اس سے زیادہ سخت دشواری اُن سرداروں کے لیے تھی جو اب تک اپنے اپنے قبیلوں اور گروہوں کے صاحبِ امر بنے ہوئے تھے، اُن مذہبی پیشواؤں کے لیے تھی جو ملک بھر میں شرک کے بڑے بڑے مراکز کا کاروبار چلا رہے تھے، ان کاہنوں کے لیے تھی جو غیب دانی کے مدعی تھے اور جن کی طرف لوگ اپنی گم شدہ چیزوں کے پتے پوچھنے اور اپنے مستقبل کا حال معلوم کرنے کے لیے رجوع کرتے تھے۔ ان میں سے ہر ایک کے لیے یہ رسالت گویا کھلا کھلا پیغامِ موت تھی جسے قبول کرنا تو درکنار، ٹھنڈے دل سے سننا بھی اُن کے لیے ممکن نہ تھا۔ غرض ہر وہ شخص جس کا مفاد پرانے جاہلیت کے نظام کی برقراری سے کسی نہ کسی طور پر وابستہ تھا، اس کے لیے یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ اگر لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو مان لیں اور یہ تسلیم کرکے ان کے تابع فرمان بن جائیں کہ جو کچھ وہ پیش کر رہے ہیں وہ خداوندِ ارض وسما کی طرف سے ہے تو پھر معاشرے میں اُس کا چراغ کسی طرح نہ جل سکے گا۔ اس وجہ سے یہ سارے ہی لوگ اپنے مفاد کی حفاظت کے لیے اس بات پر تل گئے کہ رسالت کی اس دعوت کو کسی طرح نہ چلنے دیں، کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ اگر عوام الناس

ایک مامور من اللہ رہنما کی پیروی اور ایک مُنَزَّل من اللہ دین و آئین کی اطاعت کو مان گئے تو پھر بالآخر انہیں بھی ہتھیار ڈال دینے پڑیں گے اور مُطاع کے بجائے مُطیع بن کر رہنا پڑے گا۔

ایک طرف یہ دشواریاں تھیں تو دوسری طرف ایک اور دشواری اور بڑی سخت دشواری اُن کے لیے یہ تھی کہ رسالت کا دعویٰ لے کر ان کے درمیان ایک ایسا شخص اُٹھا تھا جو ان کی قوم کا بہترین آدمی تھا، جس کی اخلاقی فضیلت کو ساری قوم مانتی تھی، جس کو پانچ ہی سال پہلے ساری قوم نے بالاتفاق امین کہا تھا جس نے اپنی رسالت کا دعویٰ پیش کرنے سے عین پہلے کوہ صفا پر چڑھ کر سب پوچھا تھا کہ "اگر میں تمہیں خبر دوں کہ پہاڑی کے پیچھے ایک لشکر تم پر حملہ آور ہونے کے لیے تیار ہے تو کیا تم میری بات مانو گے؟" تو سب نے کہا تھا کہ "ہاں، ہم مان لیں گے کیونکہ ہمیں تم سے کبھی جھوٹ کا تجربہ نہیں ہوا ہے"۔ اس کے بعد ان کے لیے اسی شخص کو جھوٹا قرار دینا، اور لوگوں کو بھی اس بات کا قائل کر لینا کوئی آسان کام نہ تھا کہ عمر بھر دنیا کے کسی معاملہ میں جو شخص کبھی جھوٹ نہیں بولا تھا وہ اتنا بڑا "جھوٹ" لے کر اُٹھ کھڑا ہوا ہے کہ خدا نے اسے رسول مقرر کیا ہے اور خدا کا کلام اس پر نازل ہوتا ہے۔ (اضافہ از مؤلف)

اسی کے متعلق قرآن مجید میں ایک جگہ فرمایا گیا ہے:۔

قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ	اے محمدؐ، ہمیں معلوم ہے کہ جو باتیں یہ
الَّذِیْ يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا	لوگ بناتے ہیں ان سے تمہیں رنج ہوتا ہے لیکن
يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ	یہ لوگ تمہیں نہیں جھٹلاتے بلکہ یہ ظالم اللہ کی آیات
بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ (الانعام۔۳۳)	کا انکار کرتے ہیں۔

یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ جب تک محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی آیات سنانی شروع نہ کی تھیں، آپ کی قوم کے سب لوگ آپ کو امین اور صادق سمجھتے تھے اور آپ کی راستبازی پر مکمل اعتماد رکھتے تھے۔ اُنہوں نے آپ کو جھٹلایا اُس وقت جب آپ نے اللہ کی طرف سے پیغام پہنچانا شروع کیا۔ اور اس دوسرے دور میں بھی کوئی شخص ایسا نہ تھا جو شخصی حیثیت سے آپ کو جھوٹا قرار دینے کی جرأت کر سکتا ہو۔ آپ کے کسی سخت سے سخت مخالف نے بھی کبھی آپ پر یہ الزام نہیں لگایا کہ آپ دنیا کے کسی معاملہ میں کبھی جھوٹ بولنے کے مرتکب ہوئے ہیں۔ جتنی بھی انہوں نے آپ کی تکذیب کی نبی ہونے کی حیثیت سے کی۔ آپ کا سب سے بڑا دشمن ابوجہل تھا، اور حضرت علیؓ کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ خود اس نے

نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا اِنا لا نکذبک ولکن نکذب ماجئت بہ۔ "ہم آپ کو تو جھوٹا نہیں کہتے، مگر جو کچھ آپ پیش کر رہے ہیں اُسے جھوٹ قرار دیتے ہیں"[1] جنگ بدر کے موقع پر اَخنس بن شَریق نے تخلیہ میں ابوجہل سے پوچھا کہ "یہاں میرے اور تمہارے سوا کوئی تیسرا موجود نہیں ہے، سچ بتاؤ کر محمد کو تم جھوٹا سمجھتے ہو یا سچا؟ اس نے جواب دیا "خدا کی قسم محمد ایک سچا آدمی ہے، عمر بھر کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ مگر جب لواء، اور حجابت اور سقایت اور نبوت سب کچھ بنی قُصَیّ ہی کے حصے میں آ جائے تو بتاؤ باقی سارے قریش کے پاس کیا رہ گیا؟"[2] اسی بنا پر اس آیت میں اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو تسلی دے رہا ہے کہ تکذیب دراصل تمہاری نہیں بلکہ ہماری کی جا رہی ہے، اور جب ہم تحمل و بردباری کے ساتھ اسے برداشت کیے جا رہے ہیں اور ڈھیل پر ڈھیل دیے جا رہے ہیں تو تم کیوں مضطرب ہوتے ہو؟

باقی

---

[1] یہ روایت امام سُفیان ثَوری اور حاکم نے حضرت علیؓ سے نقل کی ہے۔ (اضافہ از مؤلف)

[2] یہ روایت ابن جریر نے اپنی تفسیر میں نقل کی ہے۔ اخنس بن شَریق، جس کا یہاں ذکر کیا جا رہا ہے، بنی زُہرہ (نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ننہیالی خاندان) سے تھا۔ اگرچہ جنگ میں قریش کے ساتھ آیا تھا، مگر ابن ہشام کا بیان ہے کہ اس نے اور بنی زُہرہ نے لڑائی میں حصہ نہیں لیا۔ (اضافہ از مؤلف)

شیخ المجاہدین مفتی اعظم فلسطین رحمۃ اللہ علیہ

ایک عہد کی داستان

خلیل حامدی

۴ جولائی ۱۹۷۴ء کو الحاج محمد امین الحسینی مفتیٔ اعظم فلسطین انتقال فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون مفتی صاحب کے اُٹھ جانے سے نہ صرف تاریخ فلسطین کا ایک باب ختم ہوگیا بلکہ عالم اسلام کے اُس دور کی داستان بھی آخر ہوگئی جسے جمال الدین افغانی مرحوم، علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ اور امیر شکیب ارسلان نے شروع کیا تھا۔ مرحوم نے عنفوانِ شباب ہی میں جہاد و اتحاد کے لیے جو شمشیر اُٹھائی تھی، وہ برابر اُٹھی رہی اور صرف اُس وقت نیام میں واپس داخل ہوئی جب بیروت کے امریکن اسپتال میں مرحوم نے جان، جانِ آفرین کے حوالے کر دی۔ مفتی صاحب نے اپنی زندگی جس ہمہ پہلو جدوجہد میں کھپائی ہے اس کا ذکر ایک حکایتِ طویل اور حدیثِ ذوشجون ہے۔ ایک مضمون اس کے لیے ناکافی ہے۔ وہ ایک عالم دین تھے اور علمِ دین کے ساتھ حکمتِ دین سے بھی بہرہ مند تھے۔ وہ ایک مجاہد تھے، قائدانہ صفات سے بھی متصف اور سپاہیانہ جذبۂ ایمان سے بھی سرشار۔ وہ ایک تحریکی انسان تھے، تحریک ساز بھی اور تحریک نواز بھی۔ وہ اہلِ قلم تھے، الفاظ کے موتی بھی پروتے تھے اور دلِ صد پارہ کی قاشیں بھی اہلِ دل کو پیش کرتے تھے۔ وہ ایک خطیبِ لبیب تھے اور تقریر کو تاثیر سے الگ نہ ہونے دیتے تھے۔ وہ بہترین انسانی اخلاق کا پیکر تھے۔ تواضع، ملنساری، مہمان نوازی، شفقت و محبت، ضعفاء اور مساکین سے ہمدردی اور کرم و سخاوت میں اُن جیسی مثالیں دنیا میں کم ہی ملتی ہیں ـــــ وہ خود بھی بے بہا خوبیوں کے مالک تھے اور دنیا میں بھی جہاں کہیں کوئی ایسا انسان انہیں نظر آیا جو مسلمانوں کے لیے مخلص اور اسلام کے لیے دل میں تڑپ رکھتا تھا اُس کے بھی وہ تادمِ آخر گرویدہ رہے۔

مفتی صاحب مرحوم ۱۸۹۷ء میں بیت المقدس میں پیدا ہوئے - ابتدائی اور ثانوی تعلیم بیت المقدس ہی میں پائی - جدید علوم کے ساتھ اسلامی علوم اور عربی اور فرانسیسی زبانوں میں دستگاہ حاصل کی - پھر مصر چلے گئے اور ازہر یونیورسٹی میں داخل ہوگئے - اور تلاشِ علم صرف ازہر کی چار دیواری تک ہی محدود نہ رکھی بلکہ اسی زمانے میں وہ سید رشید رضا کی مجلسوں میں بھی شرکت کرتے رہے - اور مصری یونیورسٹی (موجودہ قاہرہ یونیورسٹی)، کے آرٹس کالج میں بھی پابندی سے لیکچر سنتے رہے اور عمرانی علوم میں مدرک حاصل کرتے رہے - طبیعت میں جستجو اور پرواز کا مادہ وافر موجود تھا - اس لیے مصر میں تعلیمی عرصہ کے دوران تعلیمی فضا سے نکل کر عام اہلِ علم کی مجلسوں میں شرکت بھی کرتے رہے - اس دور میں مصر کے تمام نمایاں رہنماؤں اور اہل ادب و لغت اور اربابِ دعوت وعزیمت کے ساتھ انہوں نے اپنے تعلقات استوار کر لیے - اور ان کی صحبتوں سے بھرپور استفادہ کیا - امتِ عرب اور عالمِ اسلامی کے حالات پر ان سے تبادلۂ خیالات کرتے رہتے اور ان کی بیداری اور ترقی اور استعمار سے نجات کے راستے سوچتے رہے - ان میں مصر کے قومی لیڈر سعد زغلول پاشا بھی تھے اور مصطفیٰ لطفی منفلوطی جیسے ادیب و انشاء پرداز بھی - ان دنوں ازہر نہ صرف ایک تعلیمی درسگاہ تھی بلکہ جہاد و حریت کا ایک فعال مرکز تھا - مرحوم نے ازہر میں جو تربیت پائی اُس کا خلاصہ خود اُن کی زبان میں یہ ہے کہ "اسلام جہاد سے عبارت ہے اور جہاد کے بغیر کوئی قوم عزت وغیرت کے ساتھ دنیا میں زندہ نہیں رہ سکتی" چنانچہ ازہر سے فارغ ہو کر فلسطین واپس آئے - مگر فلسطین میں زیادہ دیر تک قیام نہ کر سکے بلکہ جذبۂ جہاد اور شوقِ قتال کے تحت وہ استنبول چلے گئے اور عثمانیہ ملٹری کالج میں داخلہ لے لیا - تاکہ اُصولِ حرب وضرب سے واقفیت حاصل کریں، اور علم وجہاد اور سیف وقلم دونوں کے جامع بنیں - یہ پہلی جنگِ عظیم کا زمانہ تھا - موصوف نے ملٹری کالج سے تربیت پاکر عثمانی فوج میں شرکت کی اور ایک فوجی عہدے پر فائز ہوگئے اور صوبہ ازمیر (سمرنا) میں عثمانی فوج کے ۴۶ ویں ڈویژن میں شامل ہوگئے - موصوف کچھ عرصہ تک اِزمیر یونیورسٹی کے مذہبی امور تدریس وتربیت سرانجام دیتے رہے اور اپنی پاکیزہ اور بھرپور جوانی کو دعوت وجہاد دونوں ضرورتوں کے لیے تیار کرتے رہے -

جب پہلی جنگِ عظیم ختم ہوئی تو مفتی صاحب مرحوم استنبول سے فلسطین پہنچے - ترکی میں انہوں نے نہ صرف جنگی تربیت حاصل کر لی تھی بلکہ خلافتِ عثمانیہ کے مرکز میں رہ کر انہیں عالمی سیاست کے انداز بھی سمجھنے کا موقع ملا - اور خاص طور پر انہیں یہ اندازہ ہوگیا کہ انگریزوں اور یہودیوں کی ملی بھگت کس طرح

فلسطین کو عربوں سے چھیننا چاہتی ہے اور اس غرض کے لیے کیا کیا سازشیں تیار کی جا رہی ہیں۔ خود عثمانی خلافت کے خاتمے کے لیے یہودی جو ریشہ دوانیاں کر رہے ہیں اُن کے بعض پہلو بھی مفتی صاحب کے علم میں آئے۔ ان معلومات کو لے کر مفتی صاحب اپنے وطن فلسطین کو لوٹے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب فلسطین دو عظیم فتنوں سے دوچار ہوا۔ ایک لارڈ بلفور کے ڈیکلریشن کا اعلان جو نومبر ۱۹۱۷ء کو صادر ہوا۔ اس ڈیکلریشن کی رُو سے برطانیہ نے فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن قرار دے دیا۔ جو گویا آگے چل کر فلسطین کے اندر یہودیوں کی باقاعدہ ریاست قائم کر دینے کی تمہید تھی۔ نامور یہودی مصنف آرتھر کوسٹلر کے الفاظ میں اس ڈیکلریشن کی حقیقت یہ تھی کہ "ایک قوم نے ایک دوسری قوم کو ایک ایسی سرزمین بخش دینے کا پروانہ دے دیا جو ایک تیسری قوم کی ملکیت تھی"۔ دوسرا فتنہ جس سے مفتی صاحب مرحوم یکایک دوچار ہوئے وہ فلسطین پر انگریزی انتداب کا تھا۔ ۱۹۱۷ء میں انگریزی فوج پہلی مرتبہ عرب فوجوں کی مدد سے فلسطین میں داخل ہوئی تھی۔ کیونکہ عرب فوجیں ترکی کے مقابلے میں برطانیہ کی حلیف بن چکی تھیں اور اس کے عوض وہ برطانیہ کی مدد سے عرب ممالک کی آزادی اور وحدت کے خواب دیکھ رہی تھیں۔ مگر برطانوی استعمار کا یہ وعدہ جھوٹ تھا۔ اور عربوں کا خوابِ استقلال و آزادی سراب تھا۔ انگریزی فوجیں خود فلسطین پر قابض ہوگئیں۔ اور ۱۹۲۲ء میں مجلس اقوام کی طرف سے فلسطین کو باقاعدہ انگریزی انتداب میں دے دیا گیا۔ گویا انگریزی فوج کی سنگینوں کے زیر سایہ یہودیوں کے اقتدار کا انتظام کر دیا گیا۔

ان حالات میں مفتی صاحب نے جو کردار ادا کیا ہے وہ اپنے دور کا صحیح تقاضا تھا۔ اور ایک عالمِ دین جو دین کو جہاد و قتال سے عبارت سمجھتا ہو خالی وعظ و تبلیغ پر اکتفا کیسے کر سکتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے ایک مجاہد اور انقلابی انسان ہونے کی حیثیت سے نئے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے انجمنیں قائم کیں، علمی اور ادبی اداروں کی بنیاد ڈالی اور سیاسی اور ثقافتی تنظیموں کی تشکیل کی۔ اور ان کے ذریعہ سے عرب نوجوانوں کے اندر بیداری اور آزادی کی روح پھونکی، برطانوی انتداب اور پروانۂ بلفور کی مزاحمت شروع کر دی۔ اور برطانوی استعمار اور صہیونی سازش کے خلاف آزادیٔ فلسطین کی تحریک برپا کر دی۔ بیت المقدس میں پہلا انقلابی شرارہ اپریل ۱۹۲۰ء کو بھڑکا۔ اس انقلابی شرارے کے قائد مرحوم مفتی محمد امین الحسینی تھے اور اس کے سپاہی بیت المقدس کے نوجوانوں کی ایک جانباز جماعت تھی۔ اور ۲۳ سال کا ایک خوبرو شعلہ بداماں نوجوان انگریزوں اور یہودیوں کے مقابلے میں اپنے ہم عمروں کی ایک مختصر تنظیم لے کر سینہ سپر ہو گیا تھا۔ اس

"بغاوت" کے جرم میں اس نوجوان قائد کی گرفتاری کے احکام صادر ہوئے مگر وہ نوجوان استعماری سنگاکوں کو طرح دیتا رہا اور ان کی گرفت میں نہ آسکا۔ چنانچہ انگریزوں کی فوجی عدالت کی طرف سے جو اس بغاوت کے اسباب کی تحقیق کے لیے تشکیل دی گئی تھی مفتی صاحب کو دس سال قید بامشقت کی سزا سنائی گئی۔ مفتی صاحب خفیہ طریقے سے شرق اردن کے قبائل میں پہنچ گئے اور ان کے سربراہوں اور سرداروں سے رابطہ قائم کیا اور انہیں دفاع فلسطین کے لیے متحد کوششوں کے لیے آمادہ کیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب شام کو آزادی مل چکی تھی۔ اور شریف حسین کا لڑکا امیر فیصل بن حسین شام کا حاکم مقرر ہو چکا تھا۔ مفتی صاحب مرحوم اس خیال سے شام چلے گئے کہ وہاں کام کے زیادہ مواقع ہوں گے۔ اور زیادہ آزادی کے ساتھ مسئلہ فلسطین کی خدمت کرسکیں گے۔ مگر شام کی یہ آزادی چندروزہ تھی۔ فرانس نے مسلح حملہ کرکے شام پر قبضہ کرلیا اور اس کی آزادی کو ختم کردیا۔ مفتی صاحب دمشق سے نکل کر شام کے صحرا میں نکل گئے اور عرب قبائل کے اندر تحریک آزادی پھونکتے رہے۔ اسی دوران اُن کے خلاف سزائے قید کا جو حکم صادر ہوچکا تھا وہ منسوخ ہوگیا اور مفتی صاحب دوبارہ فلسطین لوٹ گئے۔

۱۹۲۱ء میں اہل فلسطین نے اس نوجوان مجاہد کی قدردانی کے طور پر اسے فلسطین کی مسندِ افتاء سونپ دی۔ اور اُسے قائدِ جہاد ہی نہیں پیشوائے دین بھی تسلیم کرلیا۔ اس سے پہلے یہ عظیم منصب اُن کے مرحوم بھائی سید محمد کامل الحسینی کے پاس تھا۔ مفتی صاحب مرحوم کی مقبولیت میں روزانہ اضافہ ہو رہا تھا۔ اہل شجاعت اور مشتاقانِ حریت بھی ان کے گرد جمع ہو رہے تھے اور اربابِ صدق و صفا بھی۔ ۱۹۲۲ء میں انہیں فلسطین کی اعلیٰ اسلامی کونسل کا صدر بھی منتخب کرلیا گیا، اور اوقاف کے امور اور شرعی عدالتوں کا نظم و نسق بھی ان کے ہاتھ آگیا۔ ایک طرف ان کے ہاتھ میں شمشیر براں تھی جس سے یہود و انگریز پریشان تھے اور دوسری طرف ان کے سر پہ عمامۂ مشیخت تھا جو اہل فلسطین کے لیے تاج آبرو تھا۔ مفتی صاحب نے اوقاف اور قضائے شرعی کو ہاتھ میں لے کر ان دونوں اداروں کے نظم و نسق کو دوراندیش سیاست دان کی طرح بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کی۔ اور خاص طور پر اوقاف کے لیے ایسے قوانین بنائے جن کی رُو سے اراضی فلسطین کو صہیونیوں کے ہاتھ میں جانے سے روکا۔

مفتی صاحب نے عملی جدوجہد کے ساتھ سیاسی میدان میں بھی اپنی کوششوں کو تیز کردیا۔ ان کا مدعا انگریزی انتداب کا خاتمہ اور بلفور ڈیکلریشن کے بعد فلسطین میں یہودیوں کی آمد کو روکنا تھا۔ چنانچہ انہوں نے فلسطین کی سطح پر بھی کانفرنسیں منعقد کرنا شروع کردیں، عالم اسلامی کی سطح پر بھی تحریک کو پھیلانا شروع کردیا۔ یورپ،

امریکا اور اسلامی ممالک کے اندر بھی وفود بھیجے۔ اور خود کئی وفود میں شامل ہو کر مصر، عراق، شام، امارات خلیج، ایران، ہندوستان اور افغانستان کا دورہ کیا۔ اور عربی اور اسلامی دنیا کو مسئلہ فلسطین سے روشناس کرایا، اور فلسطین کو یہودی خطرات اور انگریزی استعمار سے نجات دلانے کے لیے ہر ممکن تگ و دو شروع کر دی۔ موصوف کی اس جدوجہد سے مسئلہ فلسطین مقامی حدود سے نکل کر عرب اور اسلامی ممالک تک پہنچ گیا۔ انگریزوں اور یہودیوں کی پالیسی یہ تھی کہ یہ مسئلہ دریائے اُردن کو عبور نہ کرنے پائے مگر مفتی صاحب کی سیمابی شخصیت نے اسے پورے عالم اسلام کا مسئلہ بنا دیا۔ مفتی صاحب کی فعال اور مؤثر شخصیت سے ہراساں ہو کر یہودیوں نے انہیں لالچ کے ذریعے دبانے کی کوشش کی۔ یہودی سمجھتے تھے کہ مفتی صاحب کی متواتر جدوجہد شاید انہیں اپنے عزائم کو شرمندۂ تکمیل کرنے کا موقع نہ دے۔ اس لیے انہوں نے ہر قیمت پر انہیں راستے سے ہٹانے کی کوشش کی۔ چنانچہ ۱۹۲۹ء میں جب فلسطین کے اندر ایک مرتبہ پھر انقلابی رو اٹھی اور انگریزوں نے پکڑ دھکڑ شروع کی اور تحقیقات کے لیے برطانیہ نے سر والٹر شو کی سربراہی میں تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی۔ مفتی صاحب نے اس کمیٹی کے سامنے دستاویزی ثبوت کے ساتھ یہ بات واضح کی کہ یہودیوں نے مفتی صاحب کو پانچ لاکھ اسٹرلنگ پونڈ رشوت کے طور پر پیش کیے تاکہ مفتی صاحب "براق شریف" (جسے یہودی دیوار گریہ کہتے ہیں) کے حقوق سے یہودیوں کے حق میں دستبردار ہو جائیں۔ مفتی صاحب نے نہ صرف اس رشوت کو یہودیوں کے منہ پر دے مارا بلکہ اُن کے ایسے ہتھکنڈوں سے مزید چوکنا ہو گئے۔

۱۹۳۰ء میں فلسطینی نمائندوں کا ایک وفد انگریزوں سے آزادیٔ وطن کی بات چیت کرنے کے لیے لندن گیا۔ مفتی صاحب مرحوم اس وفد کے ایک رکن تھے، اور اس کے صدر مشہور فلسطینی لیڈر مرحوم موسیٰ کاظم الحسینی تھے۔ اس وفد نے مسئلہ فلسطین کے سلسلے میں بڑی سرگرمی سے کام کیا۔ لندن سے یہ وفد سوئٹزرلینڈ آیا۔ اور انتداب کمیٹی کے سکرٹری جنرل سر اریک ڈرومنڈ سے ملا۔ یورپ کے دوسرے متعدد سیاستدانوں سے بھی اس نے ملاقاتیں کیں۔ اور ہر جگہ اپنی مظلومیت کی آواز بلند کی۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے مفتی صاحب نے عالم اسلامی کے اندر بھی اس مسئلہ کو اٹھایا۔ حالانکہ اس وقت اکثر مسلمان ممالک استعماری طاقتوں کے پنجے میں گرفتار تھے۔ اس سلسلے میں بیت المقدس کی اسلامی کانفرنس بڑی شہرت رکھتی ہے۔ یہ کانفرنس ۱۹۳۱ء میں مفتی صاحب نے بیت المقدس میں طلب کی تھی۔ اور دنیائے اسلام کے کونے کونے سے مندوبین شریک ہوئے۔ مسلمان رہنماؤں نے پہلی مرتبہ اس کانفرنس کی بدولت فلسطین میں یہودی عزائم اور استعماری ریشہ دوانیوں کی تفصیلات سے آگاہی حاصل کی۔ یہ کانفرنس

۷ دسمبر سے لے کر ۱۷ دسمبر ۱۹۳۱ء تک جاری رہی۔اس میں بڑے بڑے نمایاں لوگ شریک ہوئے۔ ہندوستان سے علامہ اقبال، مولانا شوکت علی اور مولانا غلام رسول مہر شریک ہوئے۔ ایران سے ایران کے سابق وزیر اعظم ضیاء الدین طباطبائی، شیعہ گروہ کے مجتہد اعظم سید محمد حسین آل کاشف الغطاء، کاکیشیا کے مجاہد اعظم کے پوتے شیخ سعید شامل، شام کے سابق صدر شکری القوتلی، امیر عبدالقادر الجزائری کے پوتے امیر سعید الجزائری، مصر کے نامور پیشوا علامہ سید رشید رضا، بیروت کی اعلیٰ اسلامی کونسل کے صدر نامور مؤرخ و لغت دان مصطفی الغلابینی، چینی رہنما موسیٰ جار اللہ، وسطی افریقہ کے مسلمانوں کے نمائندے کمانڈر طارق نائیجری، لنکا کے زہرا کالج کے پروفیسر مسٹر رؤف پاشا، نامور ترک فلسفر رضا توفیق اسی طرح یوگوسلاویہ، جاوا، برقہ اور دوسرے ممالک کے مندبین شریک ہوئے۔اس کانفرنس کی کامیابی میں تونس کے زعیم شہید عبدالعزیز الثعالبی کی کوشش کو بھی غیر معمولی دخل حاصل ہے۔ الغرض یہ پہلی اسلامی کانفرنس تھی جس نے عالم اسلام کے ایک مخصوص مسئلے پر تمام دنیا کے مسلمانوں کی آواز یکجا کر دی۔

جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں مفتی صاحب نے نہ صرف آزادیٔ فلسطین کا علم بلند کیے رکھا اور جہاد کو اپنا شعار بنایا بلکہ وہ پوری مسلم ملت کی بہبودی کے لیے سرگرم کار اور مسلمانوں کے اتحاد و یگانگت کے لیے ہر ممکن کوشش کرتے رہے۔ ۱۹۳۴ء کی بات ہے کہ مملکت سعودیہ اور یمن کی مملکت متوکلیہ کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ خلافت عثمانی کے خاتمے اور استعماری غلبے کے بعد دو آزاد مسلمان مملکتوں کے اندر جنگ کا چھڑ جانا بہت افسوسناک اور تباہ کن صورت تھی۔ چنانچہ مفتی صاحب مرحوم نے اسلامی کانفرنس کے صدر ہونے کی حیثیت سے فوری طور پر ایک وفد کی تشکیل کی جس میں شام کے سابق صدر جمہوریہ ہاشم الاتاسی، اس دور کے نامور مسلمان لیڈر امیر شکیب ارسلان اور محمد علی علوبہ پاشا مصر کے ایک وزیر اور مصر کی دستور پارٹی کے سکرٹری جنرل شریک کیے گئے۔ اور خود مفتی صاحب اس وفد کے سربراہ تھے۔ چنانچہ اس وفد نے دو مسلمان اور عرب مملکتوں کے درمیان صلح کی مساعی کا آغاز کر دیا۔ پہلے یہ وفد مملکت سعودیہ گیا اور سلطان عبدالعزیز ابن سعود سے ملا اور انہیں ترکِ جنگ پر آمادہ کیا۔ اور پھر مملکت متوکلیہ (یمن) گیا اور امام حمید الدین یحییٰ سے ملا اور انہیں جنگ سے باز رہنے کی تلقین کی۔ چنانچہ اس وفد کی کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ باہمی جنگ ختم ہوگئی۔ مسلمانوں کی آپس کی خونریزی بند ہوگئی۔ اور اصلاح ذات البین کی برکت اس قدر پائیدار ثابت ہوئی کہ دونوں مملکتوں کے مابین تعلقات بہتر سے بہتر صورت اختیار کرتے گئے۔

یہ تعلقات ۱۹۶۳ء میں دوبارہ اس وقت متاثر ہوئے جب جمال عبدالناصر کی تدبیر کے تحت یمن میں فوجی انقلاب

برپا ہو گیا اور مصری فوج یمن میں داخل ہو گئی۔ موجودہ دور میں ان دونوں مملکتوں کے تعلقات پھر بہتر ہو چکے ہیں)۔

فلسطین کی تاریخ جدید میں سب سے بڑی عوامی بغاوت ۱۹۳۶ء کو بھڑکی۔ اسے فلسطین کی "بغاوت عظمی" کا نام دیا جاتا ہے۔ اس "بغاوت عظمی" کی تدبیر میں مفتی صاحب مرحوم کی حکمت و دانش اور ایمان و عزم کو غیر معمولی دخل حاصل ہے۔ یہ بغاوت پوری فلسطینی قوم کی مشترکہ جدوجہد کی آئینہ دار تھی۔ اس میں دوسری بڑی مجاہد شخصیت شیخ عزّالدین القسّام کی تھی جسے فلسطین میں وہی مقام حاصل ہے جو امیر عبدالقادر الجزائری کو الجزائر کی جنگ آزادی اور امیر عبدالکریم الخطابی کو مراکش میں حاصل ہے۔ "بغاوت عظمی" کے بھڑک جانے پر فلسطینی رہنماؤں نے "اعلیٰ عرب کمیٹی" کے نام سے ایک محاذ قائم کیا۔ مفتی صاحب مرحوم تمام جماعتوں کے کلی اتفاق سے اس کے صدر منتخب کئے گئے۔ اس کمیٹی نے بغاوت کی قیادت کی۔ اس میں ہزاروں فلسطینی نوجوان جام شہادت نوش کر گئے۔ فلسطینیوں نے انگریزوں اور یہودیوں کے چھکے چھڑا دیئے۔ پورے چھ ماہ تک یہ بغاوت جاری رہی۔ اور پورے ملک کے اندر چھ ماہ تک عام ہڑتال کی کیفیت رہی۔ اور آخر کار خود عرب سربراہوں کی دخل اندازی کے بعد یہ بغاوت فرو ہوئی۔ سلطان عبدالعزیز ابن سعود، بادشاہ غازی فرمانروائے عراق، امام یحییٰ حمیدالدین امام یمن اور امیر عبداللہ بن حسین امیر شرق اردن نے ایک مشترکہ برقیہ مفتی صاحب مرحوم کو ۸ر اکتوبر ۱۹۳۶ء کو بھیجا جس میں ان سے اپیل کی گئی کہ یہ بغاوت ختم کر دی جائے۔ انگریز اس بات پر آمادہ ہیں کہ وہ فلسطین اور اہل فلسطین کے ساتھ پورا پورا انصاف کریں گے (اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!) چنانچہ اس برقیے کی وصولی کے بعد مفتی صاحب نے اعلیٰ عرب کمیٹی کا اجلاس بلایا۔ اور ۱۳ر اکتوبر ۱۹۳۶ء کو ایک اعلان کے ذریعہ یہ بغاوت ختم کر دی گئی۔ بعد میں لارڈ پل کی سرکردگی میں ایک انگریزی کمیشن تحقیق بغاوت کے لیے آیا۔ اعلیٰ عرب کمیٹی نے اس کمیشن کا بائیکاٹ کرنا چاہا مگر عرب سربراہوں کے مشورے سے عرب کمیٹی نے مقاطعہ کا ارادہ ختم کر دیا۔ لارڈ پل کمیشن نے انگریزی حکومت کو جو رپورٹ پیش کی اس میں یہ تجویز کیا کہ فلسطین کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ ایک حصہ عربوں کے پاس رہے اور دوسرا یہودیوں کو دے دیا جائے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۳۷ء میں دوبارہ بغاوت کے شعلے بھڑک اٹھے۔ انگریزی حکام نے فوج اور پولیس کی بھاری جمعیت لے کر مفتی صاحب مرحوم کو گرفتار کرنا چاہا۔ چنانچہ فوج اور پولیس دونوں نے مل کر بیت المقدس میں اعلیٰ عرب کمیٹی کے دفتر کا محاصرہ کر لیا۔ اس وقت مفتی صاحب کی صدارت میں کمیٹی کا اجلاس

ہو رہا تھا۔ لندن کا اخبار ٹائمز ۱۶ رجولائی ۱۹۳۷ء کے شمارے میں حکومت برطانیہ کو یہ مشورہ دے چکا تھا کہ "مفتی ہر مسئلے کے حل کے لیے سنگِ راہ بنا ہوا ہے۔ یہودیوں کے ساتھ کسی مفاہمت کو یہ شخص کامیاب نہیں ہونے دیتا۔ اگر مفتی کا خوف نہ ہو تو بہت سے اعتدال پسند فلسطینی لیڈر یہودیوں سے مفاہمت کے لیے تیار ہیں۔ برطانوی حکومت کا فرض ہے کہ وہ مفتی کو آزاد نہ چھوڑے۔ بلکہ اس کا قلع قمع کر دے اور اعلیٰ اسلامی کونسل کی صدارت سے اُسے معزول کرائے۔ نہ صرف اسے بلکہ تمام انتہا پسندوں کی گردن دبوچے"۔ ٹائمز کے اسی مشورے کے تحت انگریز ہائی کمشنر فوج اور پولیس کی مدد سے مفتی صاحب کا محاصرہ کر چکا تھا۔ اور محاصرے سے پہلے اس نے حیفا کی بندرگاہ پر ایک بحری جہاز کا انتظام کر رکھا تھا جس سے مفتی صاحب کو ماریشس جلاوطن کیا جانا تھا۔ مگر مفتی صاحب بڑی پھرتی اور دانشمندی کے ساتھ دفتر سے نکل گئے۔ اور مسجد اقصیٰ کے صحن میں پناہ گزین ہو گئے جہاں فلسطینی مجاہدین کی ایک بھاری جمعیت اسلحہ اور سامانِ حرب کے ساتھ پہلے سے جمع تھی۔ اور اس بات پر آمادہ تھی کہ انگریزوں کے ساتھ مسلح تصادم شروع کر دے۔ انگریزی فوج نے مسجد اقصیٰ کے دروازوں کو چاروں طرف سے محصور کر لیا۔ تاکہ جو شخص بھی مسجد سے باہر نکلے اُسے گرفتار کر لیا جائے۔ انگریزی فوج کا محاصرہ اور مجاہدین کی پناہ گزینی مسلسل تین ماہ تک جاری رہی۔ اشیائے خورد و نوش کے سوا کوئی چیز اندر داخل نہ ہو سکتی تھی۔ مفتی صاحب تمام دنیا سے کٹ چکے تھے۔ انگریزی فوج کے لیے یہ آسان نہ تھا کہ مسجد میں داخل ہو کر دارو گیر کا سلسلہ جاری کرے۔ مفتی صاحب مرحوم نے اپنی ڈائری میں اس واقعہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> • انگریزوں نے پریشان ہو کر آخر کار یہ تدبیر اختیار کی کہ وہ ہندی مسلمانوں پر مشتمل ایک فوجی دستہ بیت المقدس لائیں۔ تاکہ وہ دستہ مسجد میں گھس کر مجھے اور دوسرے مجاہدین کو گرفتار کرے[۱]۔

---

[۱] انگریز فوجی مسجد اقصیٰ میں گھسنے کی ہمت نہ رکھتے تھے۔ اسی لیے وہ مسلمان فوجیوں کو لائے۔ اور وہ بھی ہندوستان کے مسلمان فوجی۔ کسی اور مسلمان قوم کے فوجی اس بارے میں اُن سے تعاون کے لیے تیار نہ تھے۔ ہندوستان کے مسلمان فوجیوں کو آقا کی وفاداری میں ان باتوں کی پروا نہ تھی۔ بیت اللہ پر گولی چلانے کے لیے بھی ان کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ مفتی صاحب مرحوم جو ہمیشہ ہندی مسلمانوں کے مدّاح رہے ہیں۔ ہندوستان کے مسلمان فوجیوں کا یہ کارنامہ اپنی ڈائری میں غالباً اس لیے ثبت کر دیا ہے کہ وہ کہنا یہ چاہتے ہیں: خوگرِ حمد سے تھوڑا سا گلا بھی سن لے۔

چونکہ اس اقدام سے خطرناک نتائج برآمد ہو سکتے تھے اور جانی نقصان بھی غیر معمولی پیش آ سکتا تھا، اور خاص طور پر یہ کارروائی ایسی مسجد میں مسلمانوں کے ہاتھوں پیش آتی جس کا تقدس، دینی حیثیت اور تاریخی اور اثری قیمت بہت عظیم ہے، اس لیے میں نے طے کر لیا کہ میں محاصرہ کرنے والے سپاہیوں کو کسی طرح چیر کر نکل جاؤں، اور کسی ہمسایہ ملک میں جا پناہ لوں۔ جہاں کام کی آزادی ہو اور تحریک جہاد و آزادی کو برقرار رکھا جائے جو اب تقسیم فلسطین کی انگریزی تجویز کے بعد دوبارہ قوت کے ساتھ شروع ہونے والی تھی۔"

مفتی صاحب کمال ہوشیاری سے محاصرہ چیر کر نکل گئے۔ نہ صرف انگریز فوجی انگشت بدنداں رہ گئے بلکہ پوری مغربی صحافت محو حیرت رہ گئی۔ مفتی صاحب بیت المقدس سے نکل کر ایک چھوٹی سی بادبانی کشتی کے ذریعہ لبنان پہنچ گئے۔ مفتی صاحب مرحوم نے بیت المقدس سے لے کر بیروت تک یہ بری اور بحری سفر جس تکلیف اور قلق اور خطر انگیزی کے عالم میں کیا۔ وہ نہ صرف ایک دلچسپ داستان ہے بلکہ یہ ان کے عزم و ہمت اور ایمان و ایقان کی ایک منہ بولتی تصویر ہے۔ مفتی صاحب مرحوم کا بیان ہے کہ "بیروت میں مجھ سے لندن سے ڈیلی ایکسپریس نے بذریعہ ٹیلیفون رابطہ قائم کیا اور مجھے بیس ہزار ڈالر کی خطیر رقم پیش کی کہ میں اخبار کو صرف یہ بتا دوں کہ وہ کونسا طریقہ ہے جسے میں اختیار کر کے ایسے شدید محاصرے میں سے نکل آیا ہوں۔ لیکن میں نے ایک تو حمیت کے پیش نظر یہ پیشکش ٹھکرا دی اور دوسرا اس خیال سے کہ ابھی مسئلہ فلسطین نازک مرحلے سے گذر رہا ہے اور یہودی اور استعماری دشمن تعاقب میں ہیں اس لیے شاید مجھے آئندہ بھی ایسی خطر انگیزی کی ضرورت پیش آ جائے۔ بلکہ بالفعل میں اس طریقہ کو بار ہا اختیار کرنے پر مجبور رہا۔" انگریزوں کو جب یہ اطلاع ملی کہ مفتی صاحب بیروت پہنچ گئے ہیں تو انھوں نے فرانسیسی حکام سے رابطہ قائم کر کے مفتی صاحب کو اپنی تحویل میں لینا چاہا مگر لبنان کے مسلم عوام اور دینی اور سیاسی رہنماؤں نے اس کے خلاف شدید مظاہرات کیے جن کی وجہ سے فرانس نے انگریزوں کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ مفتی صاحب دوسری جنگ عظیم کے شروع تک لبنان میں رہے۔ اور عرب رہنما اور مجاہدین ان سے وہاں جا کر ملتے رہے۔ اور اپنی تحریک کو ہر طرح جاری رکھنے کے لیے کوشاں رہے۔

بیت المقدس سے مفتی صاحب کا خروج کوئی اچانک اور شخصی فیصلہ نہ تھا بلکہ یہ تحریک آزادی کے رہنماؤں کے مشورے کے تحت ہوا تھا۔ جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے، یہ نئی بغاوت پل کمیشن کی اس تجویز کے خلاف بھڑکی تھی کہ فلسطین کو تقسیم کر دیا جائے۔ یہ نئی بغاوت یا تحریک آزادی نے یکایک شدت اختیار کر لی اور مجاہدین فلسطین

اور انگریزی فوج دونوں طرف سے جانی اور مالی نقصانات کی خبروں نے اسے مزید تیز کر دیا۔ چنانچہ انگریزوں نے مسجد اقصیٰ میں پناہ لینے والے اور دوسرے متعدد فلسطینی مجاہدین کو گرفتار کر کے جزیرہ سیشل میں جلاوطن کر دیا۔ اور جب صوبہ الجلیل کا گورنر ایک فلسطینی مجاہد کے ہاتھوں مارا گیا تو انگریزوں نے اس کے بعد فلسطین کی تمام تنظیموں کو توڑ دیا، وسیع پیمانے پر گرفتاریاں شروع کر دیں اور اعلیٰ اسلامی کونسل کا نظم بھی ختم کر دیا اور اسے ایک تین رُکنی کمیٹی کے حوالے کر دیا جس کے دو رکن انگریز تھے اور اس کا صدر مسٹر کرکبرائڈ تھا۔ ان حالات کو دیکھ کر مجاہدین کی تنظیموں نے خفیہ اجلاسوں کے ذریعہ یہ فیصلہ کیا کہ ۱۵ اکتوبر ۱۹۳۷ء کو یکایک ملک گیر بغاوت کی آگ بھڑکائی جائے۔ اس بغاوت کا مرکز شام میں تجویز کیا گیا اور مفتی صاحب کو مشورہ دیا گیا کہ وہ بیت المقدس سے نکل کر لبنان جائیں اور وہاں سے دمشق پہنچ کر مرکز تحریک کی قیادت ہاتھ میں لیں۔ مفتی صاحب جب لبنان پہنچ گئے تو انہوں نے بارہا دمشق داخل ہونے کی کوشش کی۔ فرانسیسی حکام نے انہیں پہلے انگریزوں کے سپرد کر دینا چاہا اور بعد میں عوامی مظاہروں کے پیش نظر انہیں لبنان میں ذوق نامی ایک گاؤں میں رہنے پر مجبور کر دیا گیا۔ اس گاؤں میں مفتی صاحب کو رہنما آکر ملتے رہے اور تحریک کا لائحہ عمل سوچتے رہے۔

۱۹۳۹ء میں جب دوسری عالمگیر جنگ کے شعلے بھڑک اٹھے تو برطانیہ نے دوبارہ فرانس پر یہ دباؤ ڈالا کہ مفتی صاحب مرحوم کو انگریزوں کے سپرد کر دیا جائے۔ لبنان چونکہ فرانس کے زیر تسلط تھا اس لیے انگریز فرانس کی منظوری کے بغیر مفتی صاحب پر ہاتھ نہ ڈال سکتے تھے۔ مفتی صاحب کو جب اس اندرونی گفت وشنید کا علم ہوا تو وہ لبنان سے بغداد ہجرت کر گئے اور یہ سفر بھی انہوں نے جس خفیہ طریقے سے اور طرح طرح کے مصائب کے ساتھ کیا ہے۔ وہ ان کے غیر معمولی جرأت کا آئینہ ہے۔ ۱½ سال تک بغداد میں مقیم رہے۔ مفتی صاحب کے علاوہ اور بھی بہت سے فلسطینی قائدین بغداد میں پناہ لے چکے تھے۔ اور بغداد کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنا رہے تھے۔ کیونکہ عراق انگریزی نفوذ اور فلسطین میں انگریزی سامراج اور صہیونی تسلط پر شدید ردّ عمل کا اظہار کر رہا تھا۔ مفتی صاحب مرحوم جب بغداد پہنچے تو اس وقت عراق میں نوری السعید کی وزارت قائم کی۔ نوری السعید انگریزوں کا خیر خواہ تھا۔ اور پوری قوم اور عراقی رہنماؤں کی غالب اکثریت کے برعکس انگریزوں کی سیاست کے لیے راستہ ہموار کر رہا تھا۔ مفتی صاحب ۱۵ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو عراق میں داخل ہوئے اور ۲۹ مئی ۱۹۴۱ء کو انہوں نے عراق ترک کر دیا۔ عراق کا یہ دور شدید خلفشار اور عراقی اور انگریزی کشمکش کا دور تھا۔ ۱۹۳۰ء کے معاہدہ کی رُو سے انگریزی فوج کو عراق کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی نہیں کرنی چاہیے تھی۔

مگر انگریز جیسا کہ وہ عہد شکنی، منافقت اور محسن کشی میں مشہور ہے اس معاہدے کی پابندی سے اپنے آپ کو بالا سمجھ رہا تھا۔ عراق میں انگریزی فوج کے دو بڑے اڈے تھے۔ ایک حبانیہ کی چھاؤنی جو بغداد سے چند میل کے فاصلے پر تھی اور دوسری شعیبہ کی چھاؤنی جو بصرہ سے متصل واقع تھی۔ عراقی عوام، عراقی فوج اور اکثر عراقی رہنما انگریزوں کی بار بار معاہدہ شکنی سے پیچ و تاب کھا رہے تھے۔ مفتی مرحوم نے اس دور میں عراق کے مختصر عرصۂ قیام کے اندر متعدد خدمات سرانجام دیں:

جب نوری سعید کی وزارت کے بعد رشید عالی کیلانی کی وزارت قائم ہوئی تو مفتی صاحب نے رشید عالی کیلانی سے مل کر جوان کے گہرے دوستوں میں سے تھا، عراق میں موجود فلسطینی مجاہدین کی عسکری تربیت کا انتظام کیا۔ اور اس تربیت کے بعد فلسطینی مجاہدین کا خاصا مضبوط فوجی دستہ وجود میں آگیا۔ ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم چھڑ گئی۔ عراقی رہنماؤں کے اندر اس معاملے میں اختلاف پیدا ہو گیا کہ آیا عراق کو جنگ سے الگ رہنا چاہیے یا اتحادیوں اور محوری طاقتوں میں سے کسی ایک طاقت کا ساتھ دینا چاہیے۔ نوری سعید اور اس کے انگریز نواز دوست انگریزوں کی خواہش اور طلب کے تحت عراق کو انگریزوں کا دُنبالہ بنانا چاہتے تھے۔ اور عراقی فوج کو اتحادیوں کے ساتھ مل کر جنگ میں جھونکنا چاہتے تھے۔ جب کہ عراقی فوج اور رشید عالی کیلانی کا گروہ انگریزوں کے خلاف تھے، بلکہ اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر انگریزوں کی بیخ کنی کرنا چاہتے تھے جو عراق پر بھی مکمل استیلاء کے منصوبے بنا رہے تھے اور فلسطین و شرق اردن میں بھی اپنا اقتدار قائم کر رہے تھے۔ چنانچہ نوری سعید نے اپنے دورِ وزارت میں جرمنی اور اٹلی کے ساتھ تعلقات ختم کر لیے۔ مگر عراق میں اس کے خلاف احتجاج ہوا۔ رشید عالی کیلانی کو وزارت بنانے کی دعوت دی گئی تو اس نے جرمنی اور اٹلی سے تعلقات بحال کر لیے جو انگریزوں کے لیے ایک شدید صدمہ تھے۔ اس مسئلے میں عراقی رہنماؤں میں اختلاف بڑھ گئے۔ مفتی صاحب مرحوم نے اپنی دانشمندی اور حکمت کاملہ کے ذریعے متنازع فریقوں میں صلح کرا دی۔ چنانچہ رشید عالی کیلانی وزیراعظم اور نوری سعید وزیرخارجہ مقرر ہوئے اور اس نازک موقع پر ملکی صفوں میں اتحاد کی فضا پیدا ہو گئی۔

ان کوششوں کے ساتھ ساتھ مفتی صاحب مرحوم نے عراق کی ایک اور لحاظ سے بھی قابلِ قدر خدمت سرانجام دی۔ عراق اور سعودی عرب کے تعلقات خراب چلے آ رہے تھے۔ اور بعض ایسے قبائل عراق میں موجود تھے جیسے قبائل شمّر اور قبائل زبیر جن کی شاخیں سعودی عرب میں آباد تھیں۔ قبائلی روابط

کے ہوتے ہوئے دونوں حکومتیں تعلقات کی پراگندگی برداشت نہ کرسکتی تھیں اور روزانہ طرح طرح کی پیچیدگیاں جنم لے رہی تھیں۔ مفتی صاحب مرحوم اس موقع پر آگے بڑھے اور انہوں نے ایک طرف عراقی حکومت کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ سلطان ابن سعود سے اپنے اختلافات ختم کر دے اور دوسری طرف ایک وفد کے ذریعہ سلطان ابن سعود کو مصالحت پر راضی کیا۔ چنانچہ مفتی صاحب کی مساعی بار آور ہوئیں اور دونوں حکومتوں کے درمیان مستقل طور پر تعلقات استوار ہوگئے۔ اس سے پہلے مفتی صاحب سلطان ابن سعود اور امام یمن کے درمیان مصالحت کا عظیم کام سرانجام دے چکے تھے۔ اصلاح ذات البین اسلام کی عظیم ترین خدمات سے ایک خدمت ہے۔

رشید عالی کیلانی اور دوسرے مخلص عراقی رہنماؤں نے جب انگریزی فوج کی مزاحمت کا فیصلہ کیا تو مفتی صاحب مرحوم نے فلسطینی مجاہدین سمیت باقاعدہ ان سے تعاون کیا۔ انگریزوں نے انڈین آرمی کی ایک بڑی تعداد عراق بھیج دی تھی۔ ۱۸ اپریل کو یہ آرمی عراق میں داخل ہوئی۔ عراقی حکومت نے اسے معاہدے کی خلاف ورزی سمجھا اور انڈین آرمی کو عراق میں داخل ہونے سے روکا۔ یہ مزاحمت بڑھتے بڑھتے جنگ کی شکل اختیار کر گئی۔ ۲ مئی ۱۹۴۱ء کو انگریزوں نے عراقی فوج پر حملہ کر دیا۔ ۲۷ مئی ۱۹۴۱ء کو بغداد پر چڑھائی کر دی۔ عراقی فوج نے بغداد خالی کر دیا اور عراق کے شمال میں پہاڑی علاقے کو اپنا مرکز بنا لیا۔ مفتی صاحب مرحوم باقاعدہ فوج کے ساتھ لڑتے رہے۔ اور فوج کے ساتھ ہی شمالی علاقے کی جانب چلے گئے۔ انگریز ان کے پہلے ہی سے درپے تھے اب ان کی تلاش مزید ہونے لگی۔ چنانچہ مرحوم نے ۲۹ مئی ۱۹۴۱ء کو عراق سے ایران نکل گئے۔ عراق کا عرصۂ قیام بھی مرحوم نے نہ صرف مسئلہ فلسطین کی خدمت میں گزارا بلکہ عراق کی خدمت میں بھی بھرپور طریقے سے حصہ لیا۔ جمال الدین افغانی جہاں جاتے تھے فکری جنگ لڑتے تھے۔ امین الحسینی جہاں گئے سیف و سنان سے دشمن کا مقابلہ کیا۔ مرحوم نے جرمن لیڈروں سے اپنے تعلقات کو استعمال کیا۔ اور عراق میں بیٹھے ہوئے ان سے روابط قائم کیے، اور انہیں خطوط لکھ کر عربوں کی مدد کے لیے اکسایا۔ چنانچہ اسی زمانے میں ہٹلر اور جرمنی کی وزارت خارجہ کے ساتھ مفتی صاحب کی جو مراسلت ہوئی ہے وہ آج بھی مفتی صاحب کی ڈائری میں حرفاً حرفاً موجود ہے۔

عراق پر انگریزوں کی چیرہ دستی کے بعد مفتی صاحب مرحوم کے لیے اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ کسی اور ملک کی طرف کوچ کر جائیں۔ چنانچہ وہ ایران روانہ ہوگئے۔ ایران اور عراق کے باہمی تعلقات خوشگوار تھے۔ ایرانی حکومت عراق سے فرار ہو کر آنے والوں کو پناہ دے رہی تھی۔ بغداد سے طہران تک ان کا سفر بھی نہایت

مخدوش حالات میں ہوا۔ انگریزی جاسوس مفتی صاحب کے تعاقب میں تھے اور مفتی صاحب ہر موقع پر ان کو طرح دے جاتے تھے۔ ایران جاکر انہیں معلوم ہوا کہ روس اور جرمنی میں اختلاف برپا ہو چکا ہے اور اُس کے اثرات ایران پر بھی فوری عکس انداز ہو رہے ہیں۔ ایران کے اندر چار سو جرمن ماہرین مختلف کارخانوں میں کام کرتے تھے۔ چنانچہ برطانیہ اور روس دونوں حلیف حکومتوں نے ایران کو الٹی میٹم دیا کہ یہ جرمن ماہرین جاسوس ہیں انہیں برطانیہ اور روس کے حوالے کیا جائے۔ رضا پہلوی مرحوم کی حکومت نے جواب دیا کہ یہ لوگ اہل فن ہیں، ان کا امور سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے اور حکومت ان سے کسی حال میں بے نیاز نہیں ہو سکتی۔ مگر اتحادیوں نے اپنے رویّے پر اصرار کیا اور ایران اپنے موقف پر ڈٹا رہا۔ چنانچہ ایران پر اتحادیوں کے حملے کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ اس صورتِ حال نے مفتی صاحب کے لیے ایران کو "پناہ گاہ محترم" نہ رہنے دیا۔ ایرانی حکام کے ساتھ مفتی صاحب مرحوم ۱۹۲۴ء سے اپنے تعلقات استوار کیے ہوئے تھے اور مسئلہ فلسطین پر بارہا ان کی ہمدردیاں حاصل کر چکے تھے اور ان کے نتیجے میں ایران کے وزیر خارجہ سید باقر الکاظمی ۱۹۳۳ء میں اور ایران کے وزیر اعظم و وزیر خارجہ فروغی ۱۹۳۷ء میں مسئلہ فلسطین لیگ آف نیشنز میں پیش کر چکے تھے۔ مفتی صاحب مرحوم ایران میں محض ایک سیاسی پناہ گزین کی حیثیت سے داخل ہونے کے بجائے ایران کے بہی خواہ کی حیثیت سے داخل ہوئے۔ وہ ایران میں قدم رکھتے ہی ایران کے وزیر خارجہ آغائے عامری سے ملے۔ اور انہیں بتایا کہ انگریز ایران پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس امر کی اطلاع مفتی صاحب مرحوم کو عراق کے کرنل مرحوم صلاح الدین صباغ نے دی تھی۔ کرنل صلاح الدین صباغ عراقی مندوب کی حیثیت سے اُس اجتماع میں شریک ہوئے تھے جو اتحادیوں نے ۱۹۴۰ء میں جنرل ویگان کی صدارت میں منعقد کیا تھا۔ جنرل ویگان ان دنوں مشرق اوسط میں اتحادی فوجوں کا اعلیٰ کمانڈر تھا۔ اس اجتماع میں ایران پر قبضہ کرنے کے لیے مفصل منصوبہ تیار کیا گیا تھا۔ کرنل صلاح الدین صباغ مرحوم نے عراق واپس آکر اس منصوبے سے مفتی صاحب مرحوم کو آگاہ کیا اور حملے کا نقشہ بھی انہیں تیار کر دیا تاکہ مفتی صاحب اس منصوبے سے ایرانی حکام کو بروقت آگاہ کر دیں۔ مفتی صاحب نے اتحادیوں کی اس سازش سے اور اس نقشۂ جنگ سے جس میں ان راستوں کی نشاندہی کی گئی تھی جن سے برطانوی فوجیں ایران کے جنوب اور مغرب سے حملہ آور ہونے والی تھیں وزیر خارجہ ایران کو باخبر کر دیا۔ وزیر خارجہ نے جواب دیا کہ انگلستان کے ساتھ تو ہماری کوئی عداوت نہیں ہے۔ اس لیے مجھے انگریزوں کی طرف سے ایران پر جارحیت کی توقع نہیں ہے۔ مگر چند ہفتے نہ گزرنے پائے تھے کہ برطانیہ نے ایران پر حملہ کر دیا اور عین اس نقشے کے مطابق کیا جسے مفتی صاحب آغائے عامری

کو بتا چکے تھے۔

ایران میں مفتی صاحب مرحوم کا قیام خطرے سے خالی نہ تھا۔ انہوں نے اپنے دیگر ساتھیوں سمیت ترکی سفیر کے ذریعہ ترکی جانے کی اجازت طلب کی۔ مگر انقرہ سے یہ اطلاع آئی کہ رشید عالی کیلانی اور دوسرے لوگوں کو اجازت ہے۔ مگر مفتی صاحب اور ان کے اہل وعیال کو انقرہ اس وقت سیاسی پناہ نہیں دے سکتا۔ اتحادیوں کے ایران پر حملے کے بعد مفتی صاحب اور دوسرے فلسطینی مجاہدوں نے اپنے قیام کے بارے میں وزیر خارجہ ایران سے دوبارہ ملاقات کی۔ وزیر خارجہ نے کہا کہ "آپ لوگ اطمینان سے ایران میں رہیں۔ ایران اس قدر حمیت سے خالی نہیں ہے کہ آپ لوگوں کو دشمنوں کے حوالے کر دے"۔ بایں ہمہ مفتی صاحب مرحوم اور ان کے ساتھی ایران میں اس طرح رہتے رہے کہ خود ایرانی حکام کو بھی ان کے ٹھکانے کا علم نہ تھا۔ اگست ۱۹۴۱ء میں طہران پر برطانوی بمبار منڈلانے لگے اور لوگوں کے اندر خوف وہراس پیدا ہو گیا۔ مفتی صاحب مرحوم نے افغانستان میں پناہ لینے کا ارادہ کر لیا۔ افغانی سفیر کے ذریعے حکومت افغانستان نے مفتی صاحب کو جواب دیا کہ "ہم آپ اور آپ کے ساتھیوں کا کابل میں خیر مقدم کریں گے"۔

افغانستان کے وزیر خارجہ فیض محمد خان سے مفتی صاحب ۱۹۳۳ء میں سفر ہند کے دوران متعارف ہو چکے تھے۔ اور اس وقت سے دونوں کے درمیان دوستانہ تعلقات چلے آ رہے تھے۔ بلکہ انہی دنوں فیض محمد خان نے مفتی صاحب مرحوم سے یہ شکوہ کیا تھا کہ عراق اور مصر نے ابھی تک افغانستان سے سفارتی تعلقات قائم نہیں کیے۔ چنانچہ مفتی صاحب مرحوم نے رشید عالی کیلانی جو ان دنوں عراق کے وزیر اعظم تھے، سے مل کر کابل میں عراق کا سفیر بھجوایا اور اسی طرح مصر کے وزیر اعظم حسن صبری پاشا کو بھی اس سلسلے میں ایک خط لکھا۔ اور مصر اور افغانستان میں سفراء کا تبادلہ کروایا۔ مفتی صاحب مرحوم افغانوں کے زندگی بھر مداح رہے ہیں۔ افغانوں کی شہامت وشجاعت کے وہ بڑے دلدادہ تھے۔ فقیر ایپی کے ساتھ ان کے تعلقات تھے۔

مرحوم افغانستان جانے کے لیے پر تول رہے تھے۔ مگر انہیں شبہ ہوا کہ افغانستان کے سفارت خانے کا ایک ملازم برطانیہ کا جاسوس ہے۔ اور اس نے یقیناً ان کے سفر افغانستان سے انگریزی حکام کو آگاہ کر دیا ہوگا۔ اس شک کی بنا پر مفتی صاحب نے افغانستان جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ مفتی صاحب مرحوم بڑے زیرک اور صاحب بصیرت انسان تھے۔ ان کا شک درست نکلا۔ یہ ملازم ہندی الاصل تھا اور غالباً قادیانی تھا، اور انگریزوں کا جاسوس تھا۔ اس کے بعد مفتی صاحب طہران میں کسی خفیہ مقام پر ٹھیرے رہے۔ اور افغانستان کے بجائے انہوں نے اب چھپ چھپا

کر ترکی جانے کا ارادہ کرلیا ۔جہاں تک انگریزوں کی طرف سے ان کی تلاش کا تعلق ہے، اُن کے سراغ رسانی کے محکمے کوئی کسر نہ اُٹھا رہے تھے ۔ ۲۹ راگست کو ایرانی دارالحکومت پر انگریز اور روسی دونوں افواج کا قبضہ ہوچکا تھا ۔ رضا پہلوی کا خاندان پہلے ہی طہران سے اصفہان جا چکا تھا ۔طہران پر اتحادی قبضہ کے بعد انگریزوں اور ایرانی نمائندوں کے درمیان گفت وشنید شروع ہوئی اور انگریزوں نے رضا پہلوی کو آمادہ کیا کہ وہ واپس طہران آجائیں اور حکومت سنبھال لیں ۔چنانچہ ایسا ہی ہوا ۔ مگر اب ایرانی حکومت آزاد نہ تھی بلکہ اتحادیوں کی غلام تھی۔ اس کے نتیجے میں مفتی صاحب کا وہ تحفظ بھی ختم ہوگیا جو انہیں سابقہ حکومت کے تحت حاصل تھا ۔ گو نئی حکومت نے ان تمام عربوں کو یقین دلا دیا تھا کہ انہیں کوئی خطرہ نہیں ہوگا مگر یہ صرف انگریزوں کی ایک روایاتی فریب کاری تھی ۔

برطانوی فوج کے ڈائی کمانڈر مارشل ویول نے طہران میں داخل ہوتے ہی یہ اعلان کیا کہ "جو شخص مفتی امین الحسینی کو پکڑ کرلائے گا یا ایسی معلومات فراہم کرے گا جن کی مدد سے انہیں زندہ گرفتار کیا جاسکتا ہو یا مُردہ اُسے ۲۵ ہزار اسٹرلنگ پونڈ انعام دیا جائے گا " اس اعلان کے بعد نہ صرف انگریزی جاسوس بلکہ خود ایرانی پولیس کے انسپکٹر جنرل آقائے مقدادی بھی مفتی صاحب کا سراغ لگانے میں منہمک ہو گئے ۔ مارشل ویول نے شاہ رضا پہلوی سے ذاتی طور پر ملاقات کی اور ان سے مفتی صاحب کی گرفتاری کا مطالبہ کیا ۔مفتی صاحب نے حالات کی نزاکت کا اندازہ کرلیا اور ترکی کا رُخ کرلیا ۔ راستے میں پہاڑی علاقوں کے اندر شدید سردی تھی اور یہ مجاہد تہی دست تھا ، گرم لباس بھی پاس نہ تھا ۔شمالی علاقوں پر جہاں سے اُسے گزرنا تھا روسی افواج قابض تھیں ۔ الغرض مرحوم تحقیق وتعاقب کے کٹھن اور خطرناک مراحل عبور کرتے ہوئے دو ہفتوں کے پُرصعوبت سفر کے بعد خفیہ طور پر ترکی میں پہنچ گئے ۔ صرف اللہ کی ذات انہیں ہر مقام پر دشمنوں کی دسترس سے بچاتی رہی اور لطف یہ ہے کہ مفتی صاحب استنبول میں تھے اور برطانیہ کا وزیر خارجہ مسٹر ایڈن ایوانِ نمائندگان میں ایک ممبر کے سوال کا جواب دیتے ہوئے ایوان میں یہ اعلان کر رہا تھا کہ ۔۔

"مفتی جو برٹش امپائر کا دشمن نمبر ایک ہے ، ہمارے قبضے میں آچکا ہے ، طہران میں وہ جس مکان میں چھپا ہوا تھا اُسے اب ہماری فوجوں نے گھیرے میں لے رکھا ہے "

مرحوم اپنے اہل وعیال کو ایران ہی چھوڑ گئے ۔ بلکہ یہ جہاں جاتے تھے تنہا ہوتے تھے ۔ ان کے اہل خانہ بعد میں اُن سے آملتے تھے ۔ ایران میں اُن کے خاندان والوں کے ساتھ شدید بدسلوکی گئی ۔ طہران میں مفتی صاحب کی خفیہ رہائش گاہ کو جہاں سے مفتی صاحب کچھ روز پہلے نکل چکے تھے ، محصور کرلیا گیا ۔ اُن کے اہل خانہ جو دس افراد پر مشتمل تھے اور ان میں ۳ سال تک کی کم عمر بچی بھی تھی ، اس جگہ ابھی موجود تھے ۔ چنانچہ انہیں گھر سے نکلنے سے روک دیا گیا ۔ اور ایک ماہ

تک انہیں وہیں نظر بند رکھا گیا۔ اس کے بعد فوجی پہرے کے اندر انہیں ایران کے جنوب میں اہواز کی جیل میں ڈال دیا گیا۔ یہ جیل عادی مجرموں کے لیے مخصوص تھی۔ مفتی مرحوم کے اہل وعیال اسی اندھی جیل کے ایک چھوٹے سے کمرے میں مقفل کر دیئے گئے۔ چنانچہ ۵۲ روز تک یہ مجاہد خاندان عذاب واذیت کے جحیم میں پڑا رہا۔ اس کے بعد انہیں ٹرک کے ذریعہ بصرہ منتقل کر دیا گیا۔ بصرہ کا راستہ کچا اور تکلیف دہ تھا۔ سات گھنٹے تک ٹرک مسلسل سفر کرتا رہا اور یہ خاندان بصرہ پہنچا تو بے حد مضمحل ہو چکا تھا۔ بصرہ میں انہیں پہلے روز پولیس اسٹیشن میں رکھا گیا اور پھر ٹرین کے ذریعہ بصرہ سے بغداد روانہ کر دیا۔ بصرہ سے بغداد کا فاصلہ ۳۶۰ میل کے قریب ہے۔ انہیں تیسرے درجے میں سفر کرایا گیا۔ بغداد میں لے جا کر انہیں ایک رات کے لیے پولیس اسٹیشن میں ٹھہرایا گیا اور پھر اگلے روز بغداد سے بیت المقدس بھیجنے کا حکم جاری ہوا۔ اور یوں آرام کیے بغیر انہیں چھ سو میل صحرائی سفر کے لیے تیار ہونے کا حکم دیا گیا مگر بچوں نے انکار کر دیا اور سخت واویلا کیا۔ بغداد کے لوگوں کو جب اس امر کا علم ہوا تو انہوں نے بھی شدید احتجاج کیا۔ چنانچہ حکام نے حالات کی نزاکت بھانپ کر بچوں کو بغداد میں مفتی صاحب کے سابق مکان میں رہنے کی اجازت دے دی۔ وہاں ان کا علاج کیا گیا اور پھر چند روز کے وقفے کے بعد انہیں بغداد سے بیت المقدس بھیج دیا گیا۔

ترکی کی فضا مفتی صاحب کے لیے اب سازگار نہ تھی۔ گو وہ یہاں کافی مدت رہ گئے تھے۔ بلکہ عثمانی فوج کے اندر ایک افسر کے عہدے تک فائز رہے تھے۔ مگر گردشِ احوال سے اب اسی مجاہد کے لیے ترکی کی زمین بھی تنگ ہو رہی تھی۔ خود مفتی صاحب مرحوم کے الفاظ میں: "ضاقت علینا الارض بما رحبت (زمین اپنی کشادگی کے باوجود ہمارے لیے تنگ ہو چکی تھی)۔ چنانچہ انہوں نے استنبول سے صوفیا کی گاڑی لی اور بلغاریا کو چل دیئے۔ بلغاریا سے رومانیا گئے اور رومانیا سے ہنگری ہوتے ہوئے اٹلی داخل ہو گئے۔ اٹلی میں اُن کے جانے کا مدعا یہ تھا کہ وہ دونوں محوری طاقتوں سے مل کر عرب ممالک کی آزادی کی جدوجہد کریں۔ مرحوم جب عراق اور ایران میں تھے تو ان طاقتوں کے ساتھ اُن کا رابطہ تھا۔ اور عربوں کی آزادی کے لیے ان طاقتوں کو آمادہ کیا جا رہا تھا۔ مفتی صاحب جب روم پہنچے تو اٹلی حکومت کو ان کی آمد کا علم ہو گیا۔ چنانچہ اٹلی کی وزارت خارجہ اور جرمنی کے سفارت خانے نے ان سے رابطہ قائم کیا۔ اس کے بعد مفتی صاحب مرحوم کی اٹلی کے حکمران موسیولینی سے ملاقات ہوئی۔ موسیولینی نے مفتی صاحب کا پُرجوش خیر مقدم کیا۔ اور کہا کہ میں آپ کا اپنی طرف سے اور اپنی قوم کی طرف سے خیر مقدم کرتا ہوں۔ اور دشمنوں کے ہاتھوں نجات پا جانے پر آپ کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔" مفتی صاحب مرحوم

نے اس طاقت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے موسولینی کے سامنے عربوں کی آزادی کا مطالبہ رکھا اور فلسطین کو یہودیوں کی سازش سے بچانے کی درخواست کی۔ موسولینی نے نہ صرف مفتی صاحب کو پوری پوری تائید کا یقین دلایا بلکہ جیسا کہ مفتی صاحب نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے یہاں تک اس نے کہا: "میں نے قرآن اور اسلامی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے اور مجھے معلوم ہے کہ اسلام کے اندر بڑی رواداری ہے لیکن یہودی اس رواداری سے محروم ہیں"۔ مفتی صاحب اس ملک میں غریب الدیار تھے اور نہایت بے بسی کے عالم میں یہاں پہنچے تھے۔ اور موسولینی اور ہٹلر کو صرف اس اصول کی نظر سے دیکھتے تھے کہ: "عدو عدو ك صديقك" (دشمن کا دشمن تیرا دوست ہے)۔ مگر مرحوم نے ایک غیور اور جری مسلمان ہونے کی حیثیت سے اپنا یہاں بھی فرضِ دینی ادا کیا۔ اٹلی کی وزارت خارجہ کی طرف سے مفتی صاحب کے اعزاز میں ضیافت کا اہتمام کیا گیا۔ مفتی صاحب نے اس موقع پر وزارت خارجہ کے نمائندے پر واضح کر دیا: " اٹلی نے لیبیا پر ناجائز قبضہ جما رکھا ہے اور وہاں سامراجی ہتھکنڈے اختیار کر رکھے ہیں۔ یہ رویہ عربوں کے لیے بالخصوص اور مسلمانوں کے لیے بالعموم اٹلی پر اطمینان و اعتماد میں حائل ہو رہا ہے اور ہوتا رہے گا"۔ وزارتِ خارجہ کے نمائندے نے اعتراف کیا کہ اٹلی نے اس بارے میں شدید غلطی کی ہے، اور اس اقدام سے اٹلی کو عربوں اور مسلمانوں کی عداوت کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوا اور حالیہ جنگ کے بعد ہم اس رویے میں لازماً تبدیلی کریں گے"۔

اٹلی میں مختصر عرصہ کے قیام کے بعد مفتی صاحب جرمنی تشریف لے گئے۔ جرمنی میں رہ کر انہوں نے مسئلہ فلسطین، عربوں کی آزادی اور یہودی سازشوں سے مسلمانوں کو نجات دلانے کے لیے جو کوششیں سرانجام دی ہیں وہ ایک مفصل کہانی ہے۔ یہ مختصر سا مضمون اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ جرمنی کی شکست کے بعد مرحوم جرمنی سے فرانس ہجرت کر گئے۔ اور وہاں پہنچتے ہی انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ ۱۹۴۶ء تک وہ فرانس میں قید رہے۔ مرحوم اس قدر مضبوط اعصاب اور عزم و ارادہ کے قوی انسان تھے کہ کٹھن سے کٹھن حالات میں بھی وہ کبھی مایوس اور کم ہمتی کا شکار نہیں ہوئے۔ فرانس کا قید خانہ ان کے ہوش و حواس باختہ کرنے اور اعصاب و ارادہ کو پامال کرنے کے لیے کافی تھا مگر اس فضائے تاریک اور عالم بیکسی کے اندر بھی وہ حیلہ و تدبیر میں عاجز نہیں رہے۔ ۱۹۴۶ء کی ایک رات انہوں نے قید فرانسیس سے نجات پانے کی ٹھان لی۔ چنانچہ ارادہ کو بروئے کار لاتے ہوئے انہوں نے ایک کامیاب تدبیر اختیار کی اور خفیہ طریقے سے جیل سے نکل گئے اور یکایک مصر پہنچ گئے۔ مرحوم جب فرانس کی جیل میں تھے تو ہولناک مستقبل ان کا انتظار کر رہا تھا۔ اُن کے گرفتار ہوتے ہی یہودیوں نے شور مچانا شروع کر دیا کہ مفتی

ابن الحسینی کو نورمبرگ کی عدالت میں پیش کیا جائے اور "جنگی مجرم" ہونے کی حیثیت سے ان پر مقدمہ چلایا جائے۔ یہودیوں کا الزام یہ تھا کہ نازی حکمرانوں نے دوران جنگ یہودیوں کی نسل کشی کی جو مہم چلائے رکھی ہے اُس میں مفتی کا ہاتھ ہے بلکہ مفتی نے ہی نازیوں کو اکسایا تھا کہ یہودیوں کو ختم کر دیا جائے[5]۔ اس زمانے میں یوگوسلاویہ کی حکومت نے بھی مرحوم پر چند الزامات لگائے اور انہیں شدید سزا دینے کا مطالبہ کیا۔ یوگوسلاویہ کا ایک الزام یہ تھا کہ یوگوسلاویہ کے انقلابی دستے نازی فوجوں کے خلاف گوریلا جنگ لڑ رہے تھے۔ مفتی نے ان یوگوسلاوی دستوں کی سرکوبی اور خاتمہ کے لیے بوسنہ کے مسلمانوں پر مشتمل کئی عسکری دستے منظم کیے۔ جنہوں نے یوگوسلاوی انقلابیوں کی کثیر تعداد کو کچل ڈالا[6]۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ قید فرانس کا زمانہ مفتی صاحب مرحوم کے لیے کس قدر زہرہ گداز تھا۔ اِن کوہ آسا مصائب میں بھی وہ بے حوصلہ نہ ہوئے اور اپنی نجات کا راستہ آناً فاناً پیدا کر لیا۔

مفتی صاحب مرحوم کا یوں یکایک نگرانی اور حفاظت کے کوہ گراں کو چیر کر یکایک مصر پہنچ جانا دنیا کا ایک اہم واقعہ سمجھا گیا۔ عالم عرب اور اسلامی ممالک میں اس پر بڑی خوشی کا اظہار کیا گیا۔ مغرب مفتی صاحب کی چابکدستی اور دلبری پر انگشت بدنداں رہ گیا۔ برسوں کے بعد یہ مجاہد انسان اب براہ راست اپنے ملک کے مسئلے سے دوبارہ وابستہ ہو گیا۔ چنانچہ مفتی صاحب کے مصر پہنچتے ہی بلودان دشام) میں عرب لیگ کی سیاسی کمیٹی کا اجتماع ہوا اور پھر تمام فلسطینی تنظیموں کے اتفاق سے "اعلیٰ عرب کونسل برائے فلسطین" کی تشکیل کی گئی۔ اور مفتی صاحب مرحوم اس کے بالاتفاق صدر منتخب ہوئے۔ انگریزوں نے مصری حکومت پر شدید دباؤ ڈالا کہ مفتی صاحب کو گرفتار کیا جائے اور انہیں عملی سیاست میں حصہ نہ لینے دیا جائے۔ مگر مصری حکومت عوامی دباؤ کے پیش نظر انگریزوں کا یہ مطالبہ تسلیم نہ کر سکی۔

۲۹ نومبر ۱۹۴۷ء کو نام نہاد مملکت اسرائیل وجود میں آئی اور اس کا اعلان ہوتے ہی عرب آبادی اور یہودیوں

---

۵ - یہودیوں کا یہ الزام بے بنیاد ثابت ہو چکا ہے۔ یہودیوں نے پہلی جنگ عظیم میں جرمنی سے غداری کا ارتکاب کیا تھا اور برطانیہ اور ان کی حلیف طاقتوں کے ساتھ مل کر تخریبی کارروائیاں کی تھیں۔ اس لیے نازی یہودیوں سے از خود انتقام لینے کے لیے تُلے ہوئے تھے اور موقع پاتے ہی انہوں نے ان سے بھرپور انتقام لینے کی مہم شروع کر دی۔

۶ مفتی مرحوم نے بوسنہ کے مسلمانوں کی مدد سے دو عسکری بریگیڈ تشکیل دیئے تھے۔ ان کا مقصد ان حملوں کا سدباب تھا جو جنرل میخائیل وچ (کمیونسٹ لیڈر) کی قیادت میں کرؤیا کی تشدد پسند گوریلا تنظیمیں بوسنہ کے مسلمانوں پر پے درپے کر رہی تھیں۔ اور لاکھوں مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اتار رہی تھیں تاکہ بوسنہ کو سرویا کے اندر مدغم کر سکیں۔

گے درمیان جنگ بھڑک اٹھی۔ عرب کی طرف سے مجاہدین کی کمان دو مردانِ کار کے ہاتھ میں تھی۔ ایک مفتی صاحب مرحوم جنہوں نے "جیش الجہاد" کی تشکیل کی اور نامور مجاہد عبدالقادر الحسینی کو اس کا قائد اعلیٰ بنایا۔ یہ جیش فلسطینی نوجوانوں پر مشتمل تھا۔ اور دوسرے امام حسن البنا شہید تھے۔ انہوں نے مصر و غزہ کے اخوان المسلمین پر مشتمل ایک زبردست مجاہد تنظیم کی بنیاد ڈالی جس نے یہودیوں کے چھکے چھڑا دیئے۔ یہ جنگ ۶ ماہ تک جاری رہی۔ مجاہدین نے بہت سے علاقے یہودیوں کے قبضے سے چھڑا لیے۔ یہ جنگ عرب مجاہدین جیت ہی رہے تھے کہ عرب ممالک کی افواج بھی جنگ میں شریک ہو گئیں اور پھر بہت جلد انہوں نے فائر بندی قبول کر کے ایک اچھی کارروائی کو شکست میں تبدیل کر دیا۔ مفتی صاحب مرحوم اور امام حسن البنا اور دوسرے مخلص رہنما جنگ میں عرب افواج کی شرکت کے خلاف تھے۔

۱۵ مئی ۱۹۴۸ء کو عرب افواج میدان میں اتریں۔ ایک طرف خود ان افواج کے اندر مسئلہ فلسطین کے بارے میں اختلاف تھا اور دوسری طرف استعماری حکومتیں عرب ممالک پر دباؤ ڈال کر جنگ کو رکوا رہی تھیں۔ اس کا نتیجہ اس المناک شکست کی صورت میں پیش آیا جسے آج تک عرب ممالک بھگت رہے ہیں۔ "اسرائیل" سے دس لاکھ فلسطینی یکایک نکال دیئے گئے اور اب حالات نے ایک اور پہلو سے نزاکت اختیار کی۔ مفتی صاحب مرحوم نے اس کے بعد بھی اپنی جدوجہد جاری رکھی۔ ایک طرف وہ فلسطینی مجاہدین کی امداد و آبادکاری کے لیے شبانہ روز لگے رہے۔ دوسری طرف عالمی سطح پر مسئلہ فلسطین کو زندہ رکھنے اور دنیا کو اس سے آگاہ کرنے میں مصروف رہے اور تیسری طرف اسلامی ممالک اور دوست حکومتوں کو برابر آزادیٔ فلسطین کے لیے آمادہ کرتے رہے۔ ۱۹۵۹ء تک وہ قاہرہ رہے۔ مگر جمال عبدالناصر ان کے وجود کو برداشت نہ کر سکا۔ مرحوم وہاں سے اٹھ کر لبنان آ گئے اور لبنان میں وہ اس وقت تک محوِ جہاد رہے جب تک ان کی روح قفسِ عنصری سے پرواز نہیں کر گئی۔ ۱۹۷۴ء ان کی زندگی کا آخری سال ہے۔ مگر فروری ۱۹۷۴ء میں وہ لاہور کی اسلامی کانفرنس میں شریک ہوئے۔ اپریل ۱۹۷۴ء میں وہ مکہ معظمہ میں عالمی اسلامی تنظیموں کی کانفرنس میں شریک ہوئے اور اب جون ۱۹۷۴ء میں کوالالمپور میں مسلم وزرائے خارجہ کی کانفرنس میں شرکت کے متمنی تھے مگر صحت جواب دے چکی تھی۔ چنانچہ اپنے ایک قدیم رفیق خلیل علیا کو ایک مفصل میمورنڈم دے کر کانفرنس میں بھیجا اور اسپتال میں آخری لمحات تک اس کانفرنس کے نتائج کی پوچھ گچھ کرتے رہے ——————— ۴ جولائی کی شام کو یہ آفتاب جہاد و شجاعت آخرکار ڈوب گیا۔ مرحوم نے مسلمانوں کے اتحاد، دنیا کی اسلامی تحریکوں سے تعاون اور علی الخصوص جماعت اسلامی پاکستان کی سرپرستی اور خود پاکستان کی بہبود و بقا کے لیے جو کارنامے سرانجام دیئے ہیں وہ کسی اور فرصت میں بیان کئے جائیں گے۔

عمرہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں

مقصدِ زندگی اور معاشی مصروفیات

سید اسعد گیلانی

مقصدِ زندگی انسان کے لیے دنیا کی زندگی میں سب سے قیمتی متاع کا نام ہے۔ انسان اسی کے لیے زندہ رہتا ہے اور اسی کے لیے جان دے دیتا ہے۔

یہ دور جس میں سے ہم گزر رہے ہیں ایک مادہ پرست تہذیب کے غلبے کے سبب مادہ پرستی کا دور ہے۔ ہر کام، ہر مقصد اور زندگی کا ہر معاملہ اسی نقطۂ نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ مادہ پرستی کے اس دور کی سب سے بڑی علامت اور مظہر اس کی کاروباری مصروفیات ہیں۔ کاروبار کیا ہے ؟ وہ تمام مصروفیات جو معیشت کی خاطر اختیار کی جاتی ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ انسان شاید اس زمین پر کبھی بھی معیشت کی خاطر اتنا مصروف اور ہمہ تن مشغول نہیں رہا ہے جتنا اب اس دور میں ہے۔ خاندانی زندگی منتشر ہو رہی ہے۔ انسانوں کے انسانوں پر مختلف حیثیتوں سے قائم شدہ حقوق کا تصور دن بدن مٹتا جا رہا ہے۔ نیکی، ہمدردی، ایثار، قربانی، مروت کی خاطر کوئی تکلیف کسی دوسرے انسان کے لیے برداشت کرنا کم سے کم تر ہوتا جا رہا ہے۔ ذہنی سکون، قلبی اطمینان، رشتہ و تعلق کی ذمہ داریاں، دوستوں کی دلداریاں، اور احباب کی رفاقتیں اور رابطے سب گھٹتے جا رہے ہیں اور معاشی مصروفیات دنیا کے بازاروں میں چاروں طرف بڑھتی اور پھیلتی چلی جا رہی ہیں۔ جذباتِ محبت و مروت رکھنے والا انسان اب سخت دل اور بے مروت مشین بنتا جا رہا ہے۔ اس دور کا یہ مادی اور مشینی پہلو عالمگیر انسانی برادری کے لیے سخت تشویشناک مسئلہ ہے۔

اگر کوئی مشین بنائی جاتی ہے تو اس کے اندر تیل یا کوئلہ اس لیے جلائے جاتے ہیں کہ وہ متحرک ہو کر وہ کام انجام دے سکے جس کے لیے وہ مشین بنائی گئی ہے۔ لیکن اگر مشین کے اندر تیل ڈال ڈال کر جلانا اور پھر زیادہ سے زیادہ تیل جمع کرنا اور مشین میں ڈالنا اور جلانا ہی صرف کُل کام رہ جائے تو یہ ایک عجیب و غریب

بے مقصد اور بے معنی مشین بن کر رہ جائے گی۔ مشین بنانے والے کو آخر ایسی مشین کی کیا ضرورت ہوگی۔ کیا وہ یہ پسند نہ کرے گا کہ ایسی ناکارہ مشین کو جو صرف اس کا تیل جلاتی ہے، لیکن جس کام کے لیے وہ بنائی گئی ہے وہ کام انجام نہیں دیتی اس مشین کو آگ کی بھٹی میں ڈال کر بالکل پگھلا دے اور اس کا نام و نشان تک مٹا دے اور اس کی بجائے پھر کوئی دوسری مفید چیز بنائے۔ ظاہر ہے کہ ایسی ناکارہ مشین اگر کسی انسان کے گھر میں ہو تو اسے وہ ایک دن بھی اپنے پاس نہ رکھے گا۔ لیکن مالک الملک نے انسان کو جس نے کمانے کھانے اور پھر مزید کمانے اور مزید کھانے کو ہی مقصدِ حیات قرار دے رکھا ہے اور جس کام کے لیے اسے پیدا کیا گیا ہے اس کی طرف اسے لمحہ بھر کے لیے بھی توجہ دینے کی فرصت نہیں رہ گئی ہے نہ صرف اپنی کائنات میں رکھا ہوا ہے بلکہ اسے مہلت پر مہلت مل رہی ہے اس لیے کہ دنیا کے کمرۂ امتحان میں جو مہلت اسے دی گئی ہے وہ تو اُسے بہر حال ملے گی۔ اگرچہ تباہی اور بربادی کے بار بار اُٹھنے والے طوفان بتاتے ہیں کہ قافلۂ انسانیت کسی بہت بڑی تباہی کے غار کی طرف مسلسل بڑھتا چلا جا رہا ہے۔

انسانوں کے اندر مصلحین کا ایک طبقہ ہمیشہ رہا ہے جس کی پوری طرح پیروی نہ کرنے کے باوجود انسان نے ان کی زندگی کو ہمیشہ اپنے لیے نمونے کی اعلیٰ تر زندگی قرار دیا ہے۔ اگر ایسے مصلحین کی زندگیوں کو دیکھیں تو ان میں سے ایک بہت بڑی تعداد ایسی دکھائی دیتی ہے جو معاشی مصروفیات کے اس بے پناہ روز و شب کے چکر سے اپنے آپ کو بڑی حد تک آزاد رکھتی رہی ہے۔ ان کے نزدیک معاشی مصروفیات ہمیشہ ثانوی حیثیت پر رہی ہیں۔ انھوں نے چونکہ ہمیشہ ایک اعلیٰ تر مقصدِ زندگی کو اپنے پیشِ نظر رکھا اور اس کے لیے جدوجہد کی، اس لیے وہ معاشی مصروفیت کے چکر کو اولیت دے ہی نہ سکتے تھے۔ انسان کے اندر رہنے والے حیوان سے زیادہ اس کے اندر رہنے والے انسان کی راہنمائی کا مقصد ہمیشہ اُن کے سامنے رہا ہے۔

آج ہم ہر طرف معاشی مصروفیت کے چکر کو بے پناہ تیزی سے چلتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ جس میں انسانوں کے ہجوم فرعون کے غلاموں کی طرح شب و روز جُتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ صبح جاگتے ہیں تو اس جوئے میں جُت جاتے ہیں اور رات آتی ہے تو نڈھال ہو کر ذہن میں حساب و کتاب کا الجھاوا لیے ہوئے سو جاتے ہیں، اور صبح اُٹھ کر پھر اسی عذابِ معاشی مصروفیات میں مبتلا ہو جاتے ہیں آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ انھیں یہ معلوم ہی نہیں کہ ان کا مقصدِ زندگی اس کے سوا کچھ اور بھی ہے۔ وہ اسی کو مقصدِ حیات سمجھتے ہیں اور اسی کے لیے چیونٹیوں کی طرح دن رات مصروف رہتے ہیں۔ ہم جس کو

بھی دیکھتے ہیں کہ اُسے معاشی مصروفیات کے سوا کسی دوسرے مقصدِ زندگی کا شعور ہوگیا ہے اور اس شعور نے اس کی عملی زندگی پر بھی اثر ڈالا ہے اور وہ اس کے لیے اپنے دل میں ایک تڑپ کے ساتھ کچھ نہ کچھ کرنے پر بھی آمادہ ہوگیا ہے۔ البس دم میں سے اس کا یہ کاروباری چکر ذرا سست پڑنے لگتا ہے۔ عفریتِ معاش کی کنڈلی کی گرفت اس کے گرد آہستہ آہستہ ڈھیلی ہونے لگتی ہے۔ پورے عروج پر چڑھی ہوئی معاشی پینگ کچھ اُترنے لگتی ہے اور وہ دوسروں سے معاشی دوڑ میں ذرا کچھ پیچھے رہنے لگتا ہے اور معاملہ قوتِ لایموت اور رزقِ کفاف پر آ رُکتا ہے۔ اسی طرح جب ایک مقصدِ حیات کو لے کر کام کرنے والے آدمی کا کاروبار چمکنے لگ جاتا ہے، معاشی مصروفیت بڑھ جاتی ہے۔ بنک بیلنس میں اضافہ ہونے لگتا ہے، اور وہ اپنے احباب اور رفقاءِ مقصد سے ملاقاتیں اور میل ملاپ کچھ کم کر دیتا ہے تو اچانک جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے کہ زبان سے اقرار کے باوجود اب اس کے سامنے مقصدِ زندگی وہ نہیں رہ گیا ہے جس کا وہ اقرار کرتا ہے بلکہ مقصدِ زندگی دن بدن معاشی مصروفیت اور معاشی کاروبار بنتا چلا جا رہا ہے۔ پھر وہ دوستوں کی مجلس سے غائب ہونے لگتا ہے۔ پھر وہ دوستوں سے رابطہ قائم رکھنے سے گھبراتا ہے۔ پھر محسوس ہوتا ہے کہ اس کا عام ذوق بھی کچھ بدل گیا ہے۔ وہ ہم نشینی کی ذمہ داریوں سے بھی پہلو بچاتا ہے اور ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ صورت تو وہی جانی پہچانی ہے لیکن اندر ہی اندر کوئی انقلابی تبدیلی کا عمل وارد ہو رہا ہے۔ دل بدل رہا ہے، نظریں بدل رہی ہیں، اور وہ عزیز ساتھی شکل و صورت وہی رکھتے ہوئے بالکل بدلا ہی چلا جا رہا ہے۔ تب پتہ چلتا ہے کہ دَورِ جدید کا دیوِ معاش اسے ہڑپ کرتا جا رہا ہے اور وہ ہم سے دن بدن دُور ہو رہا ہے۔ پھر اگر وہ معاشی ترقی کے سوا کسی دوسرے مقصدِ حیات کا اقرار کرتا بھی رہتا ہے تو اُس کی حیثیت رسمی اور وقتی ہوتی ہے۔ ایک وقت قریب آرہا ہوتا ہے جب اس کا یہ قول جواب محض تضادِ قول و فعل کا شول ہوتا ہے جلد ہی اتر کر اندر سے ایک دوسرا آدمی برآمد ہو جائے گا۔

بلاشبہ موجودہ دَور نے دو وقت کی حلال روٹی ایک مومن کے لیے دوبھر کر دی ہے اور دو وقت کی روٹی حاصل کرنے کے لیے بھی اسے جسم میں سے خون اور پسینہ بیک وقت نچوڑنا پڑتا ہے لیکن آخر جن لوگوں نے دو وقت کی روٹی کمانے کے علاوہ بھی اپنی زندگی میں کوئی کارنامہ سرانجام دیا ہے یا کوئی جدوجہد ایسی کی ہے جسے تاریخ نے محفوظ رکھا اور انسانیت نے اسے سراہا ہے تو وہ جدوجہد ہمیشہ معاشی مصروفیت کے علاوہ کوئی دوسری ہی جدوجہد ہوتی رہی ہے۔ انسانیت کی تاریخ تو خیر اس چیز

سے ہمیشہ بے نیاز رہی ہے کہ کوئی پیدل چلتا رہا ہے یا کار میں سفر کرتا رہا ہے، پختہ جنگلوں میں رہا ہے یا کچے جھونپڑوں میں۔ اعلیٰ کھانے اور قیمتی لباس استعمال کرتا رہا ہے یا روکھا سوکھا اور موٹا جھوٹا پہنتا اور کھاتا رہا ہے۔ زمانہ تو صرف اسی کارنامے کا وزن لگاتا ہے جو کسی نے مجموعی طور پر بنی نوع انسان کی بھلائی اور رہنمائی کے لیے سرانجام دیا ہو۔ تاریخ تو کیا معاشرتی ماحول بھی اس بات کی پروا نہیں کرتا کہ کوئی اپنے گھر میں کتنی شان سے رہتا ہے اور اپنے نفس پر کتنا کچھ خرچ کرتا ہے معاشرہ بھی اپنی ذات سے ہٹ کر کسی اعلیٰ تر مقصد کے لیے کسی انسان کی مصروفیت اور ایثار سے ہی اس کی قدر و قیمت کا تعین کرتا ہے۔

معاشی کاروبار ایک ایسی چیز ہے جسے کوئی جس قدر چاہے پھیلاتا چلا جائے بلکہ جب وہ چل پڑتا ہے اور کاروباری آدمی کا اپنے کاروبار میں اخلاصِ عمل ثابت ہو جاتا ہے تو پھر وہ کاروبار خود ہی پھیل پھیل کر اس آدمی کو اپنے جال میں سمیٹنے لگتا ہے اس کے ہاتھ پاؤں اوقات دل و دماغ سب کچھ اس میں صیدِ زبون بن کر رہ جاتے ہیں اور وہ پیسہ بنانے کی ایک مشین بن کر رہ جاتا ہے۔

کیا انسان کے لیے یہ روپہلی مشین بن کر رہ جانا مفید و مطلوب ہے؟

یقیناً یہ مشینی زندگی اس شخص کے لیے ضرور مطلوب ہے جس کے سامنے خلوصِ دل سے اس کے سوا اور کوئی مقصدِ حیات نہ ہو کہ پیسہ کمایا جائے مزید کمایا جائے اور کما کما کر جمع کیا جائے اور جمع کر کر کے گنا جائے اور گن گن کر زندگی کی مسرت حاصل کر لی جائے۔

لیکن یہ مشینی زندگی اس شخص کے لیے یقیناً مطلوب نہیں ہے جسے حُسنِ اتفاق سے اس بات کا شعور حاصل ہو گیا ہو کہ اس کا مقصدِ زندگی پیسہ کمانے کے علاوہ کوئی دوسرا ہے۔ جب یہ بات سامنے آجائے کہ مقصدِ زندگی کوئی دوسرا ہے تو پھر ایسی مصروفیت جو انسان کے سارے اوقات چوس لینا چاہے اور اسے صرف اپنے ہی لیے وقف کر لینا چاہے مقصدِ حیات کی جان لیوا رقیب بن جاتی ہے۔ پھر ان دونوں مصروفیات کے درمیان سوتوں جیسا بَیر پیدا ہو جاتا ہے اور دونوں میں سے کسی ایک مصروفیت کو دوسری کے تابع ہو کر رہنا پڑتا ہے یہ فیصلہ کہ کون کس کے تابع ہو یہ فیصلہ کرنا خود اس شخص کا کام ہوتا ہے جو اس صورتِ حال سے دوچار ہوا ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اور تو جس کا جی چاہے اپنی معاشی مصروفیات کو اپنے مقصدِ زندگی پر ترجیح دیتا ہے۔ لیکن ایک مومن کو جس نے خدا اور رسولؐ کی اطاعت کو ہر اطاعت پر حاوی کرنے کا عہد کر رکھا ہو۔

اسے یہ بات ہرگز زیب نہیں دیتی کہ وہ اپنے مقصدِ زندگی پر اپنے روزمرہ کے دوسرے معاشی کاروبار کو ترجیح دے ۔ اس لیے کہ اس نے تو اپنا نام نہ کسی ملک کی نسبت سے رکھوایا ہے ، نہ نسل کی نسبت سے ، اور نہ پیشے کی نسبت سے ، بلکہ صرف اور محض مقصدِ زندگی کی نسبت سے ہی اس نے اپنا خاص نام مسلمان رکھوایا ہے اور وہ نسبتِ عجیب حاصل کی ہے جہاں یہ کہا جاتا ہے کہ تمہارا اعزاز و اکرام خدا کے نزدیک صرف تقویٰ اور دینداری کی نسبت سے ہے کسی کار کوٹھی اور دنیوی جاہ و جلال کی نسبت خدا کے ہاں نہ صرف یہ کہ پرِ کاہ کے برابر بھی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ حساب و کتاب کی میزان میں ایک بھاری بوجھ کا اضافہ کر کے حیثیتِ بندگی کو اور زیادہ مشکوک کر دیتی ہے ۔

چنانچہ فرمایا گیا :

قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ وَالْآخِرَةُ	اے نبیؐ! آپ ان سے کہہ دیجیے کہ دنیا کا سرمایہ
خَيْرٌ لِمَنِ اتَّقَىٰ	تو بہت ہی قلیل ہے اور پرہیزگاروں کے لیے آخرت
(النسآء)	بہتر ہے ۔
إِنَّمَا هَٰذِهِ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا	یہ دنیوی زندگی (اور اس کا ساز و سامان تو)
مَتَاعٌ وَإِنَّ الْآخِرَةَ هِيَ	بس چند دنوں کے استعمال کے لیے ہے اور آخرت
دَارُ الْقَرَارِ (المومن)	ہی اصل رہنے کی جگہ ہے ۔

چنانچہ دنیا اور اس کی مال و متاع جس کے لیے شب و روز اتنی مصروفیت ہے کہ انسان خدا اور رسولؐ اور اپنے مقصدِ حیات تک کو بھولا جا رہا ہے ۔ اس کی بے حقیقتی کا حضورؐ نے ایک نہایت نفسیاتی طریق پر اپنے اصحاب میں شعور پیدا فرمایا ۔

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ کا گزر بکری کے کان کٹے بچے پر ہوا جو راستے میں مُردہ پڑا تھا ۔ آپؐ نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کر کے فرمایا ” تم میں سے کوئی اس مُردہ بچے کو صرف ایک درم میں خریدنا پسند کرے گا “ عرض کیا گیا ہم تو اسے کسی قیمت پر بھی لینا پسند نہیں کرتے ۔ حضورؐ نے فرمایا ” بخدا دنیا اللہ کے نزدیک اس سے زیادہ ذلیل اور بے وقعت ہے جتنا تمہارے نزدیک یہ مُردہ بچہ ہے “ (صحیح مسلم)

حضرت ابو موسیٰؓ نے بھی ایک روایت کے ذریعے ہمیں دنیا کی مصروفیت میں آخرت یعنی مقصدِ حیات

کو بھول جانے کے خطرے سے متنبہ فرمایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا:

"جو شخص دنیا کو محبوب و مطلوب بنائے گا وہ اپنی آخرت کا ضرور نقصان کرے گا۔ پس عقل و دانش یہی ہے کہ فانی کے مقابلے میں باقی کو اختیار کیا جائے۔" (بیہقی)

اسی چیز کو حضرت عبداللہؓ بن عمر نے حضورؐ سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے کہا حضورؐ نے میرے دونوں مونڈھے پکڑ کر ارشاد فرمایا:

"دنیا میں ایسے رہ کہ جیسے تو پردیسی ہے یا رستہ چلتا ہوا مسافر۔" (بخاری)

ایک دوسرے موقع پر حضورؐ نے اپنی اُمت کے بارے میں فقر و فاقہ سے نہیں بلکہ وسعتِ دنیا کے سبب اندیشہ محسوس فرمایا۔ عمرؓو بن عوف سے روایت ہے حضورؐ نے فرمایا:

"میں تم پر فقر و فاقہ آنے سے نہیں ڈرتا لیکن مجھے تمہارے بارے میں یہ ڈر ہے کہ دنیا تم پر وسیع کر دی جائے جیسے کہ تم سے پہلے لوگوں پر کی گئی تھی پھر تم اس کو بہت زیادہ چاہنے لگو جیسے کہ انہوں نے اس کو بہت زیادہ چاہا تھا اور پھر وہ تم کو برباد کر دے جیسے کہ اُس نے ان اگلوں کو برباد کیا (صحیح بخاری و مسلم)

پھر یہ بھی فرمایا کہ:

"ہر اُمت کے لیے کوئی خاص آزمائش ہوتی ہے اور میری اُمت کی خاص آزمائش مال ہے۔" (ترمذی)

پھر فرمایا کہ:

"دو بھوکے بھیڑیے جو بکریوں کے ریوڑ میں چھوڑ دیئے گئے ہوں ان بکریوں کو اس سے زیادہ تباہ نہیں کر سکتے جتنا تباہ آدمی کے دین کو مال اور عزت و جاہ کی حرص کرتی ہے۔" (ترمذی)

اس کا یہ مطلب نہیں کہ کاروبار کوئی بُری چیز ہے یا اسے چھوڑ چھاڑ کر گوشہ نشینی اور رہبانیت اختیار کر لینی چاہیئے۔ گوشہ نشینی اور رہبانیت کی مذمت اسلام سے بڑھ کر اور کس نے کی ہے اور کسبِ حلال سے بڑھ کر مستحسن چیز اور کسے قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہاں دراصل صرف وہ کاروبار زیرِ بحث ہے جو بڑھ کر آدمی کی تمام دیگر مصروفیات اور فرائض پر اثر انداز ہو جائے۔ اور آہستہ آہستہ انسان کی نظر سے اس کا مقصدِ حیات اوجھل ہونے لگے۔ یہ لازم نہیں کہ ہر کاروبار لازماً مال کی حرص اور عزت و جاہ کی طلب پیدا کرے۔ لیکن ہر ان دونوں چیزوں کے آنے کا راستہ ضرور ہے۔ اور اگر کوئی شخص اسی راستے پر اپنے سارے اوقات لگانا شروع کر دے تو وہ ضرور ہی ایک دن ان دونوں بھیڑیوں سے دوچار

ہو جائے گا جو اس راستے سے اکثر آتے اور لوگوں کے ایمان و اخلاق و اخلاص فی الدین کی بکریوں کو پھاڑ جاتے ہیں۔

ویسے بھی انسان کے حصے میں جس قدر مال آتا ہے اس کی ذات کے لیے اس میں صرف تین ہی مدّیں ہیں جن کا ذکر حضورؐ نے حضرت ابو ہریرہؓ سے فرمایا ہے:

"بندہ کہتا ہے میرا مال میرا مال حالانکہ اس کے مال میں سے جو واقعی اس کا ہے وہ بس تین ہی مدّیں ہیں۔ جو اس نے کھا کر ختم کر دیا، جو پہن کر پرانا کر دیا، جو راہ خدا میں دے کر آخرت کے لیے ذخیرہ کر لیا، باقی جو کچھ ہے وہ دوسروں کے لیے چھوڑ جانے والا ہے۔" (مسلم)

اسی لیے حضورؐ نے فرمایا: "بندۂ دینار خدا کی رحمت سے محروم ہوا اور بندۂ درہم خدا کی رحمت سے دُور ہو۔" (ترمذی)

چنانچہ نبی کریمؐ نے فرمایا جسے حضرت ابو امامہؓ نے روایت کیا۔

"اللہ تعالیٰ نے میرے سامنے یہ بات رکھی کہ میرے لیے وہ مکہ کی وادی کو سونے سے بھر دے۔ میں نے عرض کیا میرے پروردگار میں اپنے لیے یہ نہیں مانگتا، بلکہ میں تو پسند کرتا ہوں کہ جب بھوک لگے تو آپ کو یاد کروں اور آپ کے سامنے گریہ وزاری کروں اور جب آپ کی طرف سے ملے اور پیٹ بھرے تو آپ کی حمد اور شکر کروں"۔ (ترمذی)

حضورؐ کی تربیت کے یہی وہ اثرات تھے جنہوں نے صحابہ کرامؓ کی ایک بہت بڑی تعداد کو دنیوی جاہ وحشم سے بے نیاز کر کے صرف غلبۂ اسلام پر نظریں جما دینا سکھا دیا تھا۔ حضرت ابو الدرداؓ کی بیوی روایت کرتی ہیں کہ میں نے حضرت ابو درداؓ سے پوچھا کہ آپ بھی مال منصب و عہدہ دوسروں کی طرح کیوں طلب نہیں کرتے۔ اُنھوں نے کہا میں نے اپنے آقا سے سُنا ہے کہ:

"تمہارے سامنے ایک بڑی دشوار گزار گھاٹی ہے اس کو گرانبار اور زیادہ بوجھ والے آسانی سے پار نہ کر سکیں گے۔ اس لیے میں پسند کرتا ہوں کہ اس گھاٹی کو عبور کرنے کے لیے ہلکا پھلکا رہوں۔" (بیہقی)

چنانچہ ایک کامیاب بندۂ خدا کی نشاندہی حضورؐ نے ان الفاظ میں فرمائی۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا:

"کامیاب اور بامراد ہوا وہ بندہ جس کو حقیقتِ اسلام نصیب ہوئی اور اس کو روزی بھی بقدرِ کفاف ملی اور اللہ تعالیٰ نے اس کو اس قدر قلیل روزی پر قانع بھی بنا دیا" (صحیح مسلم)

اللہ تعالیٰ نے بھی ایسے کاروبار سے منع فرمایا ہے جس میں انسان خدا ہی کو بھول جائے۔

لَا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ۔ خبردار ایسی تجارت نہ کرو کہ خدا کو بھول جاؤ۔

چنانچہ صحابہ کبارؓ میں سے ایک نہایت اعلیٰ منصب کے صحابی کے بارے میں جو بہت بڑے تاجر بھی تھے حضرت عائشہ صدیقہؓ کی روایت ہے۔

"حضورؐ نے فرمایا کہ جب میرے سامنے جنت پیش کی گئی تو سب صحابہ بہ آسانی جنت میں داخل ہو گئے لیکن عبدالرحمٰنؓ بن عوف گرتا پڑتا چلا تو بمشکل جنت کے دروازے تک پہنچا"۔

یہ بات سن کر حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے تمام اونٹ اور غلام خدا کی راہ میں دے دیئے اور عرض کی کہ اب شاید میں صحابہؓ کے ساتھ آسانی سے داخل ہو سکوں۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو ایسا کاروبار جس میں آدمی نے اپنے آپ کو پوری طرح جھونک دیا ہو۔ اس کے لیے دینی فرائض کی ادائیگی میں بھی کافی رکاوٹ ثابت ہوتا ہے بلکہ دیکھا جائے تو دین کا اپنا مزاج بھی کچھ اس قسم کا ہے کہ وہ ایسے پھیلے ہوئے وسیع کاروبار کے مخالف پڑتا ہے جو آدمی کو اپنے اندر بالکل ہی جذب کر لے چنانچہ دین کے اہم کام سارے کے سارے آدمی کو بار بار کاروبار کی گود سے کھینچ کر باہر نکال لے جاتے ہیں جس سے اسے کسی نہ کسی پہلو سے بظاہر مادی پہلو سے خسارہ ہوتا ہی ہے۔ نماز اسے پانچ بار ہر مصروفیت کو چھڑا کر اپنی طرف کھینچتی ہے اور کسی اہم ترین کاروباری عذر کو بھی نہیں سنتی۔ روزہ مسلسل ایک ماہ تک اسے بڑے بھاری پیمانے کی کاروباری مصروفیت سے کافی حد تک باز رکھتا ہے۔ حج کے لیے جانے والا آدمی چند ماہ تک کے لیے بالکل ہی کاروبار کی ہر نوعیت کو چھوڑ چھاڑ کر نکل جاتا ہے اور ایک دوسرے ہی ایسے کاروبار میں مصروف ہو جاتا ہے جہاں اسے اپنے پیچھے چھوڑے ہوئے کاروبار کا خیال لانا بھی مشکل ہوتا ہے جہاد مومن کو اگر لے جائے تو زندگی کا ہی سودا چکانا چاہتا ہے۔ یہ سارے مومن کے رب کی طرف سے اس پر عائد کئے ہوئے ایسے فریضے ہیں جو اس کے بھرپور کاروبار کی موجودہ مصروفیات میں بار بار خلل انداز ہو کر اسے بتاتے ہیں کہ چاہے تو کتنا ہی مصروف بننے کی کوشش کرے تیرے مالک کی

تکمیل تیرے ناک میں موجود ہے۔

بزرگانِ دین میں ایسے کاروباری حضرات کی بہترین مثالیں موجود ہیں جنہوں نے دین کا کام بھی جم کر کیا اور اپنے کاروبار بھی چلائے اس کی وجہ یہ تھی کہ مال کی محبت ان کے نفس پر خفیف سی گرفت بھی نہیں رکھتی تھی۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کو اگر یہ اطلاع ملتی ہے کہ آپ کا تجارتی سامان سے بھرپور جہاز سمندر میں ڈوب گیا ہے تو بھی اپنے دل کی حالت دیکھ کر وہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کہتے اور اللہ کا شکر بجالاتے ہیں کہ دلِ بے نیاز اس خبر سے غیر متاثر اور قلب مطمئن ہے۔

بنیادی بات یہ ہے کہ انسان دنیا میں کس غرض سے بھیجا گیا ہے اور آخرت میں اس سے کس چیز کا حساب لیا جانا ہے؟ کیا اس بات کا کہ اس نے دنیا میں اپنے پیچھے کتنا شاندار تمدن چھوڑا۔ کتنے کارخانے بنائے اور کتنا بنک بیلنس جمع کیا اور اپنے وارثوں کے لیے کتنا مال چھوڑا یا اس سے یہ پوچھا جانے والا ہے کہ وہ اپنے ساتھ دنیا سے اعمال کا کیا ذخیرہ لایا۔ پس جس چیز کی منزلِ مقصود پر پہنچ کر پرسش ہونی ہے آج اس زندگی میں اس کی فراہمی کی کوشش ہی سب سے زیادہ ضروری ہے اور جو چیز وہاں پوچھی ہی نہیں جاتی ہے اس کے جمع کرنے، فراہم کرنے اور ڈھیر لگانے کی کیا ضرورت ہے۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ چونکہ آخرت غیر محسوس ہے اور اس کا بگاڑ یا اس کی ویرانی آدمی کو نظر نہیں آتی اس لیے آدمی بے نیازی سے دنیا میں اُلجھا رہتا ہے جس کے بگاڑ سے اسے محسوس تکلیف ہوتی اور جس کی آبادی سے اُسے نمایاں آرام و راحت ملتے ہیں۔ اس طرح دنیا نے انسان کو چاروں طرف سے گھیر کر اسے اپنی بھول بھلیوں میں ایسا مبتلا کیا ہے کہ اس کے اندر اپنے اصل گھر کی یاد اور اس کی آبادی سے دلچسپی رکھنے کا جذبہ ہی سرد کر دیا ہے۔

ظلم یہ ہے کہ کاروباری اور معاشی مصروفیت نے اپنی حد سے بڑھ کر ایسے ایسے لوگوں کو اپنے گھیرے میں لے لیا ہے جن کے یوں گھر جانے کا کبھی وہم بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس کاروباری مصروفیت کے ہاتھوں ہم نے بڑے بڑے زخم کھائے ہیں۔ ایسے ایسے پرانے دوست اور دین کے مجاہد اس کاروباری آندھی میں اپنی مصروفیت سے ہٹ کر دُور اندھیروں میں جا پڑے ہیں جن کی یاد کے زخم دل پر بڑے گہرے ہیں۔ ہم نے ایسے لوگوں کو دیکھا ہے جن کی دین کے لیے سرگرمی اور جذبۂ ذوق و شوق دیکھ کر کام کی طلب پیدا ہوتی اور رہنمائی ملتی تھی اور جن کے جذبے بڑے بیدار اور جن کے دل و دماغ دین کے لیے بڑے مستعد ہوتے تھے لیکن آج کاروبار نے گھیر گھار کر ان کو ایسا سرد کیا ہے کہ وہ چلتے پھرتے اپنے ماضی کے لاشے نظر آتے ہیں

اور انہیں دیکھ کر ایسی عبرت ہوتی ہے کہ انسان دنیا کے فانی اور عارضی چیز ہونے کی زندہ گواہیاں ان کے وجود سے حاصل کر لیتا ہے۔ لوگوں کا یہ حال دیکھ کر بے اختیار زبان پر آجاتا ہے کہ "اے کاروبار اگر تو نے کچھ لوگوں کے بنک بیلنس بنا دیئے اور کچھ لوگوں کی معاشی گاڑی کی رفتار تیز کر دی ہے تو دوسری طرف تو نے کتنے ہی جوش و خروش رکھنے والے سینوں کو سرد اور احباب کی مجلسوں کو سُونا کر دیا ہے۔ اے کاروبارِ دنیا تو کاروبارِ آخرت سے کتنی مخالفت اور متضاد فطرت رکھتا ہے۔ تو نے چلتی ہوئی تحریکوں کو سرد کر دیا ہے اور اُمنڈتے ہوئے پاکیزہ انقلابوں کے رُخ موڑ دیئے ہیں۔ تیرے اندر حیرانی و سرگشتگی کے سوا کیا رکھا ہے۔ اسلامی تحریکوں کو تو یا بر کاب اصحابِ عزیمت اور صاحبِ جنون سپاہیوں کے دستے ہی کامیابی کی منزل تک پہنچا سکتے ہیں۔

(بقیہ اشارات) کہ آؤ سیاست کو چھوڑ کر پہلے اصلاح معاشرہ کے لیے کام کرو اور اگر معاشرہ کی اصلاح کا پروگرام پایۂ تکمیل تک پہنچ جائے تو پھر حکومت خود بخود درست ہو جائے گی۔ ان نیک نفس اور پاکباز حضرات کا خلوص اپنی جگہ مسلّم مگر انہوں نے حکومت کی اصلاح کے لیے معاشرے کی اصلاح کی جو شرط لگائی ہے وہ ایک ایسی شرط ہے جسے حکایت تشنہ و سراب ہی کہا جا سکتا ہے۔ ان مصلحین کی یہ نیک توقعات دو غلط مفروضات پر قائم ہیں۔ ایک یہ کہ معاشرہ کوئی ایسا الگ تھلگ جزیرہ ہے جسے سیاست کی لہروں سے یکسر محفوظ رکھ کر اس کے اندر اپنی مرضی کے مطابق اصلاح کا کام بلا روک ٹوک انجام دیا جا سکتا ہے دوسرے ارباب اقتدار کو ان مقدس ہستیوں کے ساتھ اس حد تک تعاون کرنے پر آمادہ کرنا ممکن ہے کہ یہ حضرات جب تک اصلاح معاشرہ کے کام سے فارغ نہ ہو جائیں کم از کم اس وقت تک حکومت کی مشینری اور اس کے وسائل سے معاشرے کے اندر بگاڑ پیدا کرنے کا کام معطل رکھا جائے گا۔ آپ خود ہی غور فرمائیں کہ کیا میدان عمل میں اِن میں سے کوئی ایک چیز بھی ممکن ہے۔ جس نظم کو آپ معاشرے سے تعبیر کرتے ہیں بلکہ جس نظم اجتماعی کی چھوٹی سے چھوٹی اکائی کو آپ خاندان کا نام دیتے ہیں وہ نہ صرف ہر آن سیاسی قوتوں کی زد میں ہوتا ہے بلکہ سیاسی قوتیں اس کی صورت گری کرتی ہیں۔ جو چیز اپنے وجود کے لیے کسی بالاتر قوت کی رہینِ منّت ہو اس کے بارے میں یہ خیال کرنا کہ اسے اس کے موثر اثرات سے بچایا جا سکتا ہے ایک ایسی سادگی ہے جو راہبوں کو تو شاید زیب دیتی ہو لیکن ان مومنین کو زیب نہیں دیتی جن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتے ہیں۔

رجسٹرڈ ایل نمبر ۳۴۰۰